سرسید کی علی گڑھ تحریک

کا

مختصر تعارف

سید صمد حسین رضوی (علیگ)

سرسید احمد خاں کے صد سالہ یومِ وفات کے سلسلے میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن آف پاکستان نے سرسید یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی کے تعاون سے جو وسیع البنیاد اور گوناگوں پروگرام منعقد کیے ہیں، طبع و نشر اس کا ایک اہم جزو ہے۔ اس پروگرام کے تحت سرسید کے پیغام اور ان کی منفرد سماجی اور تعلیمی جدوجہد کی ترویج کی غرض سے ان کی زندگی اور کارناموں پر مبنی تصنیفات اور خود ان کی تخلیقات سے انتخاب کی گئی مطبوعات کی اشاعت کا خصوصی طور پر اہتمام کیا گیا ہے۔ یہ کتاب اُن مطبوعات میں سے ایک ہے۔ اُمید ہے کہ یہ کتاب تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے خصوصاً اور دوسرے لوگوں کے لئے عموماً مفید اور دلچسپی کا باعث ہوگی۔

جمال النقوی صاحب کے لیے
سید صمد حسین رضوی
18.12.2008
Rizvi
Karachi

سرسید کی علی گڑھ تحریک
کا
مختصر تعارف

سید صمد حسین رضوی (علیگ)
ہیڈ آف الیکٹرونکس ڈپارٹمنٹ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی
سرسید یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی
یونیورسٹی روڈ، کراچی
پاکستان

جملہ حقوق محفوظ ہیں

اشاعت ---------------- مارچ ۱۹۹۹ء

تعداد ---------------- ایک ہزار

طابع ---------------- خواجہ پرنٹرز اینڈ پبلشرز فون: ۲۶۸۴۳۶۳

ناشر ---------------- سرسید یونیورسٹی پریس

زیرِ اہتمام

علیگڑھ مسلم یونیورسٹی اولڈبوائز ایسوسی ایشن (پاکستان)

ایم۔آر۔کیانی روڈ، کراچی۔فون: ۵۱۰۰۰۴

مصنف کا تعارف

(۱) مصنف کا نام:- سید صمد حسین رضوی (علیگ)

(۲) والد کا نام:- سید اسد حسین رضوی

(۳) دادا کا نام:- سید احمد حسین (وکیل) المتخلص بہ تحقیق

(۴) ولادت:- ۲۳ جولائی ۱۹۲۴ء - علیگڑھ - یوپی (انڈیا)

(۵) ابتدائی طفولیت:- منگینہ (جی سی) تحصیل انوپ شہر ضلع بلند شہر - یوپی (انڈیا)

(۶) سلسلۂ نسب:- سید رضوی

(۷) لوئر پرائمری تعلیم:- اردو چوتھی جماعت گورنمنٹ اسکول سیون پور، تحصیل کاس گنج، ضلع ایٹہ - یوپی (انڈیا) ۱۹۳۵ء

(۸) اپر پرائمری تعلیم:- اردو پانچویں، چھٹی جماعت، گورنمنٹ ٹاؤن اسکول، انوپ شہر - ضلع بلند شہر، یوپی (انڈیا) ۳۷-۱۹۳۶ء

(۹) اردو مڈل:- گورنمنٹ مڈل اسکول چھرّہ ضلع علیگڑھ - یوپی (انڈیا) ۱۹۳۸ء

(۱۰) میٹرک:- گورنمنٹ ہائی اسکول علیگڑھ - یوپی (انڈیا) ۱۹۴۳ء

(۱۱) انٹر میڈیٹ:- دھرم سماج کالج علیگڑھ - یوپی (انڈیا) ۱۹۴۵ء

(۱۲) بی ایس سی (انجینئرنگ):- علیگڑھ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ - یوپی (انڈیا) ۱۹۴۸ء

(۱۳) دیگر علوم میں مہارت:- انگلش، عربی، فارسی، اردو، ہندی، سنسکرت، علم فلکیات اور رویتِ ہلال وغیرہ کی استعداد و اسناد

(۱۴) پاکستان میں آمد:- مشرقی پاکستان نومبر ۱۹۴۸ء - مغربی پاکستان اپریل ۱۹۵۰ء

(۱۵) البیرونیٔ ثانی کا لقب:- ۱۸ فروری ۱۹۷۷ء کو ایرانی اسکالروں کی جانب سے باقاعدہ تحریری طور پر "البیرونیٔ ثانی" کا لقب عطا کیا گیا۔

(۱۶) مرکزی رویتِ ہلال کمیٹی میں ٹیکنیکل مشیر:- پاکستان کی مرکزی رویتِ ہلال کمیٹی کے چیئرمین کے ٹیکنیکل مشیر، اور زونل رویتِ ہلال کمیٹی کراچی کے رکن (۱۹۹۴ء سے ۱۹۹۸ء تک)

(۱۷) رہائش:- زہرا منزل A-11 بلاک 9 دستگیر فیڈرل بی ایریا کراچی ۷۵۹۵۰ (پاکستان)

فون نمبر ۶۳۱۹۷۴۹ ۶۳۲۸۹۵۹

(۱۸) چند تصنیفات و تالیفات و مقالات:-

(۱) فضائی مدتیات (انگلش) ۱۹۳۸ء (۲) میری علیگڑھ لائف (اردو) ۱۹۳۹ء (۳) کالیداس کے ڈرامے اور نظمیں (اردو) ۱۹۵۱ء (۴) جیوتش کی سنسکرت کتاب "لگھو پاراشری" کا ترجمہ و تشریح (اردو) ۱۹۵۲ء (۵) مہابھارت کے تینتیس ابواب کا ترجمہ و تعارف (اردو) ۱۹۵۳ء (۶) البیرونی کا طریقہ رویتِ ہلال اور اس کی تشکیل جدید (انگلش و اردو) ۱۹۵۵ء (۷) سورج کے سائے سے سمت قبلہ کا تعین (انگلش و اردو) ۱۹۶۰ء (۸) قمر در عقرب کی سائنسی حقیقت (انگلش و اردو) ۱۹۶۱ء (۹) یادِ سید شوکت حسین زیدی پرنسپل اینگلو عربک کالج دہلی (انگلش و اردو) ۱۹۶۲ء (۱۰) البیرونی کی کتاب "غرۃ الزیجات" کا ترجمہ و تشریح (انگلش و اردو) ۶۳-۱۹۶۲ء یہ کتاب آٹھ مسلسل قسطوں میں حیدر آباد دکن کے سہ ماہی انگلش رسالہ "اسلامک کلچر" میں شائع ہوئی (۱۱) مرزا غالب کی ایک نجمی پیش گوئی (اردو) ۱۹۶۹ء (۱۲) مرزا غالب کی صحیح تاریخ پیدائش (اردو) ۱۹۶۹ء یہ مقالہ سہ ماہی "اردو" کراچی کے غالب نمبر میں شائع ہوا (۱۳) مرزا غالب کی نجمی شاعری (اردو) ۱۹۶۹ء یہ مقالہ بھی سہ ماہی "اردو" کراچی کے غالب نمبر میں شائع ہوا (۱۴) مرزا غالب اور مشاہدۂ فلک (اردو) ۱۹۶۹ء (۱۵) البیرونی اور مساحت ارض (انگلش و اردو) ۱۹۷۳ء، یہ مقالہ البیرونی کی انٹر نیشنل کانگریس میں پیش کیا گیا- (۱۶) رویتِ ہلال کی حقیقت (اردو) ۱۹۷۴ء (۱۷) قدیم سندھی کیلنڈر (انگلش) ۱۹۷۵ء (۱۸) امیر خسرو اور علم نجوم (انگلش و اردو) ۱۹۷۵ء (۱۹) باقیات عتیق (اردو) ۱۹۷۶ء (۲۰) اقبال اور بحر تری ہری (انگلش و اردو) ۱۹۷۷ء (۲۱) استقبال اعتدالین کی دریافت اور نجمی پیش گوئیوں پر اس کے اثرات (انگلش) ۱۹۷۹ء (۲۲) امیر خسرو کی ایجاد کردہ نجمی شاعری (انگلش) ۱۹۸۷ء یہ مقالہ شکاگو (امریکہ) میں پڑھا گیا (۲۳) البیرونی کی قمری تقویم (انگلش) ۱۹۹۰ء وغیرہ وغیرہ

☆

فہرست عنوانات

شمارات	عنوانات	صفحات
۱	پیش لفظ (جناب ظل احمد نظامی صاحب)	۷
۲	عرض مصنف	۹
۳	علی گڑھ اسپرٹ کی ایک جھلک	۱۲
۴	علی گڑھ تحریک کا پس منظر	۱۶
۵	سرسید کے خاندانی حالات	۱۹
۶	سرسید کی مصروفیات	۲۱
۷	علی گڑھ تحریک کے اغراض و مقاصد	۲۵
۸	علی گڑھ تحریک کی کامیابی	۲۹
۹	ارشادات سرسید	۳۱
۱۰	سرسید کا دو قومی نظریہ	۳۴
۱۱	سرسید کی مشکلات	۴۰
۱۲	سرسید کا طریقہ اظہار	۴۶
۱۳	سرسید کی فہم و فراست	۵۲
۱۴	سرسید کا ڈسپلن	۵۸
۱۵	سرسید کی آغاز کردہ عمارات	۶۲
۱۶	سرسید کو خراج تحسین	۶۸
۱۷	علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی اور پاکستان	۷۷

۱۸	اقامتی کالج کے متعلق سرسید کے تصورات	۸۴
۱۹	سرسید یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی کراچی کا قیام	۸۸
۲۰	سرسید یونی ورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی کراچی کے بنیادی تصورات	۹۱
۲۱	ترانۂ علی گڑھ	۹۴
۲۲	تحفۂ سرسید (نظم)	۹۵
۲۳	علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے بچھڑتے وقت (سانیٹ)	۹۷
۲۴	سرسید احمد خان کا شجرۂ نسب	۹۸
۲۵	راقم الحروف سید صمد حسین رضوی کا شجرۂ نسب	۹۹
۲۶	واقعات سرسید	۱۰۰

☆

maablib.org

پیش لفظ

سرسید احمد خان ان شہرۂ آفاق ہستیوں میں سے ہیں جن پر کثرت سے لکھا گیا ہے اور اب بھی لکھا جارہا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ سرسید کی شخصیت غیر معمولی طور پر کثیر الجہات تھی۔ سیاست، ثقافت، قومی ترقی، تعلیم، زبان، ادب، مذہب، معاشرت، اخلاق غرض انفرادی اور اجتماعی زندگی کا کوئی گوشہ مشکل سے ایسا نکلے گا جس کو سرسید نے اپنی تحریر، تقریر یا عمل سے کچھ دیا نہ ہو۔ اس لئے ان کی ذات اور خدمات کے سلسلے میں نئی معنویتیں، نئے زاویے، نئے پیرائے نکلتے رہتے ہیں اور نئی تحریروں کو جنم دیتے رہتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ جو کچھ لکھا گیا ہے وہ اپنی کیفیت اور کمیت کے لحاظ سے اتنا زیادہ ہے کہ بعض ضرورتیں پوری کرنے کے لئے خود موجودہ لٹریچر کو نئی ترتیب دینے اور نئی شکل میں پیش کرنے کے لئے نئے مقالے اور نئی کتابیں معرض وجود میں آتی رہتی ہیں۔

زیرِ نظر کتاب اوپر بیان کی گئی دو قسم کی تصنیفات و تالیفات میں سے دوسری قسم کی کوشش ہے۔ جیسا کہ مصنف سید صمد حسین رضوی صاحب نے خود ابتداء میں اعتراف کیا ہے، یہ کتاب بیشتر مولانا حالی کی حیات جاوید سے اخذ کی گئی ہے اور اس میں بعض دوسری کتابوں، مضامین اور خاندانی معلومات سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

صمد صاحب کے پیش نظر اس تصنیف کا مقصد یہ تھا کہ علی گڑھ تحریک کے محرکات، مقاصد اور عوامل کو آسان زبان میں اور سہل بیان کے ساتھ اس طرح پیش کیا جائے کہ عام لوگوں خاص طور پر طلبہ میں تحریک کی بنیادی تفہیم کی ضرورت پوری ہو جائے۔ میرے خیال میں یہ کتاب اس مقصد کو بدرجہ اتم پورا کرتی ہے۔

پاکستان میں سرسید یونی ورسٹی کا قیام مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن آف پاکستان کی ایسی کوشش کا نتیجہ ہے جس کا مقصد ہی یہ تھا کہ پاکستان میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی اعلیٰ تعلیم کے ساتھ ساتھ علی گڑھ تحریک اور اسپرٹ کی بقاء اور ترویج کی کوشش بھی کی

جائے۔ پاکستان کے قیام کے سلسلے میں علی گڑھ کے طلبہ نے جو جدوجہد کی ہے وہ مسلمانانِ برصغیر کی تاریخ کا ایک سنہرا باب ہے۔ اسی طرح قیام پاکستان کے بعد بھی علی گڑھ کے فارغ التحصیل طلبہ زندگی کے ہر شعبے میں بنیادوں کو مضبوط کرنے اور ملک کو ترقی دینے میں پیش پیش رہے ہیں۔ اب یہ حال ہے کہ بقول اقبال "جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں۔" اس لئے یہ بے حد ضروری ہے کہ سرسید اور علی گڑھ کی شاندار روایات اور بے مثال اسپرٹ کو جس حد تک بھی امکان میں ہو پاکستانی طلبہ کی نئی نسلوں میں عموماً اور سرسید یونیورسٹی اور اس کے ذیلی اداروں کے طلبہ میں خصوصاً منتقل کیا جائے تاکہ کم ہوتی ہوئی علیگ برادری کی جگہ ایک نئی ابھرتی ہوئی برادری لے سکے۔ ہم اس سلسلے میں جو کوششیں کر رہے ہیں میں سمجھتا ہوں یہ کتاب اور اس کی سی دوسری کتابیں اس میں کافی حد تک معین و مددگار ثابت ہو سکتی ہیں۔

کتاب کی خوبی یہ ہے کہ مختصر ہے لیکن سرسید، علی گڑھ تحریک اور اس کے بنیادی متعلقات کا احاطہ کرتی ہے۔ مصنف نے نہ صرف تحریک علی گڑھ کا تحریک پاکستان سے رشتہ مختصر طور پر بیان کر دیا ہے بلکہ اس ذکر کو سرسید یونیورسٹی کے قیام تک بڑھا کر حالیہ بنا دیا ہے۔ کتاب کے آخر میں صمد صاحب کے کچھ ذاتی جذبات و احساسات بھی شامل ہیں۔ جن سے ان کی اپنی مادر درسگاہ سے دلی وابستگی کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ وابستگی ایک علیگ کا خاصہ سمجھی جاتی ہے۔ اختتام کتاب پر واقعات سرسید کے نام سے سرسید کی زندگی کی کچھ اہم تاریخیں بھی دے دی گئی ہیں جن سے سرسید کی سوانح کا ایک مختصر احاطہ ہو جاتا ہے۔ یہ گوشوارہ فوری حوالے کے لئے مفید ہوگا۔

مجھے امید ہے کہ یہ کتاب ایک پسند کی جانے والی اور کام آنے والی کتاب ثابت ہوگی۔

زیڈ-اے-نظامی

صدر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن آف پاکستان و

چانسلر، سرسید یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی

☆

عرضِ مصنف

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اسلاف کے کارناموں کو سمجھے بغیر کوئی قوم اپنے اخلاف کے لئے روشن مستقبل کی تمنا نہیں کر سکتی۔ لہٰذا یہ چھوٹی سی کتاب "سرسید کی علیگڑھ تحریک کا مختصر تعارف" میں نے اس لئے لکھی ہے کہ آج کل کی نوجوان نسل کو اس بات کا کچھ علم ہو سکے کہ مسلمانانِ ہند کی بقا کے لئے ہمارے دور اندیش بزرگوں نے عموماً اور سرسید احمد خاں نے خصوصاً کیسی کیسی تکلیفیں اٹھا کر مسلم قوم کو ادب، سائنس اور ٹیکنالوجی کی اعلیٰ تعلیم سے آراستہ کرنے کی کوششیں کی تھیں، جس کے نتیجے میں ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو مملکتِ پاکستان جیسی نعمتِ عظمیٰ خدا نے ہمیں عطا کی تھی اور آج ہم دنیا کی دوسری ترقی یافتہ قوموں کے دوش بدوش اپنی منزل کی طرف گامزن ہیں۔

اس کتاب میں جتنی معلومات فراہم کی گئی ہیں وہ بنیادی طور پر مولانا الطاف حسین حالی کی کتاب "حیاتِ جاوید" سے اخذ کی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ ماہنامہ تہذیب کراچی کی مختلف اشاعتوں سے بھی مدد لی گئی ہے جن میں جناب نفیس احمد نظامی کے مضامین خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے بڑے بھائی جناب خلیق احمد نظامی مرحوم کی کتابوں سے بھی استفادہ کیا گیا ہے جو برصغیر پاک و ہند کے مایہ ناز مورخ تھے۔ ملک کے مشہور قلمکار جناب محمد ذاکر علی خاں کی منفرد کتاب "روایات علیگڑھ" سے بھی کافی اقتباسات پیش کئے گئے ہیں اور دیگر مستند کتابوں سے بھی فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ مزید براں مجھے اپنے خاندانی بزرگوں سے بھی کافی معلومات حاصل ہوئی تھیں کیونکہ ہمارا خاندان تقریباً پانچ پشتوں سے علی گڑھ ہی میں آباد تھا۔ میرے دادا سید احمد حسین شہر کے بہت بڑے وکیل تھے اور انہوں نے سرسید کی تعلیمی جدوجہد میں بہت زیادہ مالی اعانت کی تھی بلکہ کالج فنڈ میں سب سے پہلی رقم جو جمع ہوئی تھی وہ سید احمد حسین وکیل کے بازو سے اتارے ہوئے امام ضامن ہی سے حاصل ہوئی تھی جس کے متعلق خود سرسید نے لکھا ہے کہ "مجھے وہ دن خوب یاد ہے کہ میں نے ایک دوست کے بازو پر حضرت امام ضامن کی نیاز کا روپیہ بندھا ہوا دیکھا تو میں نے سوال کیا کہ کیا مسلمان قوم سے زیادہ اور کوئی قوم محتاج ہے ؟ ان الفاظ سے میرے دوست کے دل پر اثر ہوا اور وہ سبز کپڑا

جس میں وہ نذرانہ رکھی ہوئی تھی انہوں نے مجھ کو دے دیا۔ جب اس کو کھولا تو ایک روپیہ اور دو منصوری پیسے اس میں سے نکلے اور یہ پہلا سرمایہ تھا جو ہماری کمیٹی کے خزانے میں ڈالا گیا۔" یہ بھی ملحوظ رہے کہ سید احمد حسین وکیل آف علی گڑھ اور عنایت اللہ خان رئیس آف بھیکم پور کے زور دینے پر ہی سرسید نے اپنے کالج کے لئے علی گڑھ کا انتخاب کیا تھا اور پھر بعد میں باقی لوگوں نے بھی اس کی تائید کی تھی کیونکہ علی گڑھ کی فضا بہت سازگار تھی۔

اس کتاب سے خاص طور پر جن افراد کو فائدہ پہنچے گا ان میں سرسید یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی کراچی اور اس کے ذیلی اداروں کے طلبہ و طالبات شامل ہیں۔ اس یونیورسٹی کے ذیلی اداروں میں علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی کراچی' اور فہیم النساء میموریل علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی فار گرلز کراچی زیادہ اہم ہیں۔ یہ تینوں ادارے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن آف پاکستان کراچی کی اعانت و سرپرستی سے قائم ہیں اور یہ بہت بڑا کارنامہ ہے۔ مجھے فخر ہے کہ اس ایسوسی ایشن کے "کرتا دھرتا" آنریری جنرل سیکریٹری جناب محمد ذاکر علی خاں میرے کلاس فیلو ہیں یعنی ہم دونوں نے پچاس سال پہلے ۱۹۴۸ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ سے انجینئرنگ ڈگری کی تعلیم مکمل کی تھی۔

دراصل یہ کتاب میں نے ۱۷ اکتوبر ۱۹۹۶ء ہی کو مکمل کر لی تھی اور اس کا مسودہ اسی وقت ایسوسی ایشن کے چیئرمین اور سرسید یونیورسٹی کے چانسلر جناب ظل احمد نظامی کے حوالے کر دیا تھا جنھوں نے اسے شائع کرانے کا اعلان بھی کر دیا تھا لیکن چند ناگزیر وجوہ کی بناء پر یہ کتاب اس وقت شائع نہ ہو سکی۔ شاید قدرت کی یہی مصلحت ہو کہ یہ کتاب ۱۹۹۸ء میں شائع ہو جو سرسید کی وفات کی صد سالہ یادگار کا سال ہے کیونکہ سرسید کی وفات علی گڑھ میں ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو ہوئی تھی۔ اب سو سال بعد ۱۹۹۸ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن پاکستان کراچی نے ۲۱ مارچ سے ۲۸ مارچ تک سرسید کی وفات کی صد سالہ تقریبات کا انعقاد سرسید یونیورسٹی کیمپس میں بہت اعلیٰ معیار پر اور بین الاقوامی سطح پر کیا تھا جو تاریخی اعتبار سے عدیم المثال تھا اور جس میں اس دور کی مقتدر ترین علمی، ادبی اور

سیاسی شخصیتوں نے شرکت کی تھی۔ خصوصاً ۲۱ مارچ کو دو روزہ انٹرنیشنل سیمینار کا افتتاح صدر پاکستان جناب محمد رفیق تارڑ نے کیا اور ۲۷ مارچ کو سرسید یونی ورسٹی کے سب سے پہلے کنووکیشن کا افتتاح وزیر اعظم پاکستان جناب میاں محمد نواز شریف نے کیا۔ اس دن کی اہمیت کے پیش نظر حکومت پاکستان نے بھی اپنی نئی تعلیمی پالیسی کا اعلان ۲۷ مارچ ہی کو کیا تھا۔ اسی دن کی تقریب میں ان خوش قسمت پچاس علیگ بھائیوں کو بھی خصوصی انعامی نشانات عطا کئے گئے جو ۱۷ اکتوبر ۱۹۱۷ء کو یا اس سے پہلے پیدا ہوئے تھے اور ۲۷ مارچ ۱۹۹۸ء تک بقید حیات تھے۔ اسی تقریب میں میری ملاقات سرسید کے سگے پوتوں سید احمد مسعود اور سید محمود مسعود سے بھی ہوئی جنہیں خصوصی طور پر مدعو کیا گیا تھا۔ غرض یہ کہ یہ تقریب بہت ہی عظیم تقریب تھی جس کی تفصیل بیان کرنے کا یہ موقع نہیں ہے۔ صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ شدید گرمی کے باوجود پنڈال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اس دن کا شاندار لنچ بھی لوگوں کو ہمیشہ یاد رہے گا۔ اس کے دوسرے دن ۲۸ مارچ کی رات کو ایسوسی ایشن کے لان پر عظیم الشان بین الاقوامی مشاعرہ ہوا جو صبح کی اذان تک جاری رہا۔

آج ۱۷ اکتوبر ۱۹۹۸ء کو سرسید کی ایک سو اکیاسیویں سالگرہ پر بھی علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن پاکستان کراچی کی طرف سے اپنے اسی لان پر ایک بہت ہی شاندار تقریب کا اہتمام کیا گیا ہے جس میں وزیر اعلیٰ پنجاب جناب میاں محمد شہباز شریف صدارت فرما رہے ہیں اور وفاقی وزیر اطلاعات جناب مشاہد حسین سید مہمان خصوصی ہیں۔ اسی تاریخ کو میں بھی اپنی یہ کتاب اشاعت کے لئے پیش کر رہا ہوں اور دعا کر رہا ہوں کہ خدا کرے یہ کتاب جلد ہی شائع ہو کر شائقین کے سامنے آئے۔ اس کتاب کی تیاری میں جناب فضل احمد نظامی صاحب نے قدم قدم پر میری رہنمائی فرمائی ہے۔ میں ان کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔

سید صمد حسین رضوی (علیگ)

کراچی۔ ۱۷ اکتوبر ۱۹۹۸ء

شنبہ۔ ۲۵ جمادی الآخر ۱۴۱۹ھ

☆

علی گڑھ اسپرٹ کی ایک جھلک

سرسید احمد خاں کی زندگی اور ان کی علی گڑھ تحریک کا تفصیلی تذکرہ خواجہ الطاف حسین حالیؔ نے اپنی کتاب "حیات جاوید" میں کر دیا ہے۔ مسلم قوم کے ہر فرد کا فرض ہے کہ وہ اپنے قومی تشخص کی پہچان کے لئے اور سرسید احمد خاں کی تعلیمی و اصلاحی جدوجہد کی واقفیت کے لئے "حیات جاوید" کا مطالعہ ضرور کرے۔ زیر نظر کتاب میں ہم سرسید کی علی گڑھ تحریک کا مختصر تعارف پیش کرنا چاہتے ہیں تاکہ آج کل کے مسلم طلبہ و طالبات کو یہ اچھی طرح احساس ہو سکے کہ کیسے کیسے خاردار راستوں سے گزر کر ہم اس مقام پر پہنچے ہیں جہاں ہمارا نظام تعلیم خود ہمارے ہاتھوں میں آگیا ہے اور ہم جس طرح مناسب سمجھیں اپنی قوم کے بچوں کو علم کی دولت سے مالا مال کر سکتے ہیں۔

سرسید کی علی گڑھ تحریک کا مختصر تعارف بیان کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس جذبہ اخوت و یگانگت کی ایک جھلک آپ کو دکھا دیں جو سرسید کے لگائے ہوئے درخت یعنی علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے زیر سایہ فارغ التحصیل طلبہ و طالبات کے دل و دماغ میں پیدا ہو جاتا ہے۔ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کی پر کیف و پر نور فضا میں سانس لینے سے طلبہ کے ذہنوں میں جو علمی و قومی روشنی پیدا ہو جاتی ہے وہ ان کی زندگی کی ماہیت کو تبدیل کر کے انہیں ایسی پاکیزہ فطرت عطا کرتی ہے جو دین و ملک و قوم کے لئے مسیحائی کا کام کرتی رہتی ہے۔ اسی کو ہم جذبہ علی گڑھ کہتے ہیں اور اسی کو ہم علی گڑھ اسپرٹ بھی کہتے ہیں۔ یہ علی گڑھ اسپرٹ ہمیں اس قابل بنا دیتی ہے کہ ہم ہر قسم کے نامساعد حالات کو اپنی دانائی و چابکدستی سے اپنے لئے ایک خوشگوار و سازگار ماحول میں تبدیل کر لیتے ہیں۔ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے پر تاثیر ماحول کی اس سحر کاری کا حال ایک اولڈ علیگ اور اردو کے مایہ ناز و منفرد قلمکار محمد ذاکر علی خاں نے (جو علیگڑھ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن پاکستان کراچی کے آنریری جنرل سیکریٹری بھی ہیں) اپنی کتاب "روایات علیگڑھ" کے ابتدائی حصہ میں

بڑے پیارے انداز میں اس طرح بیان کیا ہے:- "علیگڑھ باپ کا سایہ ہے، ماں کی آغوش، بھائی کا بازوئے شمشیر زن ہے۔ یہ یونی ورسٹی بھی ہے اور گھر بھی جس کے آنگن میں سب اس طرح گھلے ملے خوش و خرم نظر آتے ہیں جیسے علم کے ساتھ ساتھ پیار محبت کا درس لینے آئے ہوں، اس لئے جب روایتی سند کے علاوہ یہاں سے اخوت کی ڈگری بھی لے کر نکلتے ہیں تو پھر عمر بھر عمل پیرا ہو کر اس کی عظمت کا تحفظ کرتے ہیں اور وقت ضرورت یہی سبق دہرایا کرتے ہیں۔ بلاشبہ علی گڑھ سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد درسی مضامین تو حافظہ کی گرفت سے فرار اختیار کر جاتے ہیں۔ کسی کو ہسٹری یاد رہتی ہے نہ جغرافیہ کے اسباق، لٹریچر ہو یا فلسفہ، عمر میں اضافے کے ساتھ سب ساتھ چھوڑ جاتے ہیں، لیکن اس کے برعکس علی گڑھ سے ملنے والے مواخات کے بے لوث درس میں مہ و سال کے ساتھ اضافہ ہی ہوتا رہتا ہے۔ اس لئے ہر علیگ علیگڑھ اسپرٹ کے دوامی نشے میں سرشار رہتا ہے جس اسپرٹ کی بدولت وہاں کی روپہلی راتوں اور سنہرے دنوں کی شوخ یادیں اس کے ہاتھ میں عصائے پیری نہیں آنے دیتیں اس لئے وہ تادم آخر "بوائے" کے مقام پر فائز رہتا ہے۔ چنانچہ وقتاً فوقتاً وہ یادوں کے خزینے سے موتی چن چن کر حیات مستعار کو آسودگی بخشتا ہے اور ماحول کو سازگار رکھتا ہے۔"

علی گڑھ میں تعلیم و تربیت کا بہت اعلیٰ معیار قائم ہو چکا تھا اور وہاں کے فارغ التحصیل طلبہ نے بڑے بڑے کارنامے سرانجام دیئے تھے۔ وہاں نئے طلبہ کو مستقل طور پر "فرسٹ ائر فول" بنائے رکھنے کے بجائے "انٹروڈکشن نائٹ" کا بڑا کارآمد طریقہ رائج تھا اور آپس میں شیر و شکر ہونے کے لئے "ڈنر نائٹ" بڑا موثر ثابت ہوتا تھا۔ محمد ذاکر علی خاں نے ان دونوں روایات کا ذکر نہایت اختصار کے ساتھ اس طرح کیا ہے:-

"اپنی منزل مقصود کو پانے یعنی داخلہ کا مورچہ فتح کرنے اور رہائش گاہ مل جانے کے چند روز بعد ہی ہر نووارد کو سب سے بڑے تعارفی امتحان سے دوچار ہونا ہوتا تھا۔ یہ معرکہ فردوس، علی گڑھ میں جگہ پانے کے لئے پل صراط کا کام کرتا تھا۔ جس نے اسے کامیابی سے پار

کر لیا وہ جنتی بن گیا اور علیگ کہلایا جو جھجک گیا وہ بھٹک گیا اس نے واپسی کا ٹکٹ کٹایا۔ لیکن دیکھا یہ گیا ہے کہ ہر سال جنتی تو سیکڑوں ہزاروں بنتے تھے جبکہ محرومین مشکل سے دوچار ہوتے۔ نئے طالب علموں کو درپیش اس عالم حشر کا نام "انٹروڈکشن نائٹ" ہوتا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔علی گڑھ میں "مڈ نائٹ" (کیچڑ بازی) منانے کا بھی ایک منفرد و دلچسپ انداز تھا۔ آخر جولائی یا شروع اگست میں جب پہلی موسلادھار بارش سے زمین جل تھل ہو جاتی ہیں اسی وقت ہوا کے شور سے زیادہ تیزی کے ساتھ بجلی کی چمک اور بادل کی گرج کی داد دینے اپنے اپنے کمروں سے نوجوان باہر نکل پڑتے۔ خوب نہاتے، کیچڑ ملائی ہوتی، کیچڑ کے گولے بنا کر گولہ باری کی جاتی، کشتیاں لڑتے اور اچھل کود کرتا چیختے اس قدر شور بپا کرتے کہ بادل تک سہم جاتے۔"

یونیورسٹی یونین کا سالانہ الیکشن بھی اپنی افادیت و اہمیت کے لحاظ سے اپنا جواب آپ ہی تھا۔ ذرا اس کی بھی ایک جھلک محمد ذاکر علی خاں کی پر لطف و پر مغز تحریر کے جھروکے سے دیکھ لیجیے:۔ "مختصراً تمام مختلف النوع قدیم و جدید روایات کے علی گڑھ میں یونی ورسٹی یونین کے سالانہ انتخاب کی روایت نہایت منفرد و موثر اور شاندار ہے جو نہ صرف قابل دید بلکہ لائق تقلید ہے۔۔۔۔۔ یہاں ہم یہ بیان کرتے چلیں کہ علی گڑھ کے انتخابات کا انحصار خالصۃً امیدواروں کی صلاحیتوں پر ہوتا تھا۔۔۔ پولنگ کا دن جوں جوں قریب آتا جاتا انتخاب کی مہم زور پکڑتی جاتی۔ اندازوں سے نتائج کے گراف بنائے جاتے جو لحظہ بہ لحظہ گھٹتے بڑھتے رہتے، جس کے ساتھ الیکشن کے کرتا دھرتا سینئر حضرات کے دلوں کی دھڑکنیں بھی گاہے مدہم گاہے تیز ہوتی رہتیں۔۔۔ پولنگ کے بعد ہار جیت کا کچھ نہ کچھ اندازہ ہو جاتا۔ ووٹوں کی گنتی تقریباً دس گیارہ بجے رات تک مکمل ہو کر نتائج کا اعلان ہوتا لیکن اس باقاعدہ اعلان سے قبل شکست خوردگان کے خاص خاص کارندوں کی تجہیز و تکفین کا بندوبست کیا جاتا مگر ایسے تمام حضرات کا گریجویٹ ہونا شرط تھی یعنی یہ بھی ایک اعزاز تھا جس کا ہر ایک مستحق نہیں سمجھا جاتا تھا۔ سینئرز کی شان میں نوحے اور مرثیے لکھے جاتے اور فتح و شکست کی اطلاع ملتے ہی جنازہ بردار جلوس نعرے لگاتا، نوحے پڑھتا، ناکام ہونے والوں کے کیمپوں کا رخ کرتا جہاں

چیف کارکن صاحب کو بڑے احترام سے باہر لا کر کھڑا کیا جاتا۔ ان سے اظہار ہمدردی کیا جاتا، رونا دھونا ہوتا، مزاحیہ اشعار اور مرثیے سنائے جاتے۔ الغرض صبح تک جشن الیکشن یا جشن مرگ مخالفین منایا جاتا۔"

علی گڑھ میں زندہ دلی کے مندرجہ بالا مظاہروں کے علاوہ اور بھی بہت سی دلچسپ و مفید روایات تھیں جن کا لطف صرف اس ماحول میں پہنچ کر ہی آسکتا ہے۔ مثلاً تقسیم خطابات، معاملات ایکیشوٹی، محافل مشاعرہ، سیر نمائش، ڈائننگ ہال کی ضیافتیں، شہر کی مٹرگشتیاں، ریلوے اسٹیشن کی چہل قدمیاں، سینما کی تماش بینیاں، تانگوں کی نگہبانیاں، سائیکلوں کی عقب روانیاں، یکہ کی سواریاں، کھیلوں کے معرکے، تقریروں کے مقابلے، پھیری والوں کی آوازیں، ڈاکیوں کی ہمدردیاں، دھوبیوں کی زیادتیاں، کالی شیروانیوں کی رعب داریاں، اور سیاہ برقعوں کی دلآویزیاں، وغیرہ وغیرہ۔ علی گڑھ کا ماحول شروع زمانے ہی سے ایسا دلکش رہا ہے کہ یہاں سے جانے کو جی نہیں چاہتا۔ بعض طلبہ تو کئی کئی ایم اے پاس کرتے چلے جاتے تھے تاکہ ان حسین فضاؤں میں کچھ عرصہ مزید رہنے کا موقع مل سکے۔ بعض طلبہ تو یہ تک کرتے تھے کہ مزید قیام کی خاطر جان بوجھ کر اپنے بڑے امتحانوں میں فیل ہو جاتے تھے۔ جو طلبہ فارغ التحصیل ہو جاتے تھے وہ بڑے دل گرفتہ ہو کر علی گڑھ سے رخصت ہوتے تھے، اور اگر وہ شاعر ہوتے تھے تو کچھ پر درد اشعار ضرور کہتے تھے۔ راقم الحروف نے بھی ۱۹۴۸ء میں ایک سانیٹ کہا تھا جس کا عنوان تھا "علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے بچھڑتے وقت"۔ یہ سانیٹ ماہنامہ تہذیب کراچی کے اپریل ۱۹۹۳ء کے شمارے میں شائع ہو چکا ہے۔ سرسید کے زمانے کے ایک مشہور و معروف طالب علم خوشی محمد ناظر کو جب علی گڑھ چھوڑنا پڑا تو انہوں نے اپنا دل تھام کر کہا تھا۔

کن حسرتوں سے ناظر اس انجمن سے نکلے   میلہ سا لگ رہا تھا جب ہم چمن سے نکلے

☆

علیگڑھ تحریک کا پس منظر

برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کی تاریخ بہت قدیم ہے مسلمانوں نے یہاں ایک ہزار سال تک حکومت کی تھی اور یہاں کی ہندو اکثریت کو مغلوب کر کے ان کے ساتھ حسن سلوک کا مظاہرہ کیا تھا۔ چند سیاسی بد عنوانیوں کا ارتکاب ضرور ہوا تھا لیکن مجموعی طور پر یہاں کی ہندو رعایا بڑی خوش حال رہی تھی اور ان کی عبادت گاہیں تاریخی عمارتیں اور مذہبی کتابیں ہر طرف بالکل محفوظ رہی تھیں۔ ہندوؤں پر ان کے مذہب کی وجہ سے کوئی ظلم و زیادتی نہیں کی گئی تھی اور کسی کو بزور شمشیر مجبور نہیں کیا گیا تھا کہ وہ اسلام قبول کر لے۔ مسلمان حکمرانوں نے صرف اپنی سیاسی سرگرمیوں سے سروکار رکھا تھا اور اسلام کی تبلیغ سے انکا کوئی واسطہ نہیں تھا۔ البتہ مسلمان صوفیائے کرام کی روحانی فیض رسانیوں کی وجہ سے یہاں کے ہندو عوام پر بہت اچھا اثر پڑا تھا اور وہ لوگ اسلامی تعلیمات سے سرشار ہو کر آہستہ آہستہ دامن اسلام میں پناہ لیتے گئے۔ اس طرح دیکھتے دیکھتے مسلمانوں کی تعداد اتنی بڑھ گئی کہ ان کا ایک خاص قسم کا گنگا جمنی معاشرہ قائم ہو گیا اور ہر طرف معرفت الٰہی کے چشمے پھوٹنے لگے۔ لاہور میں داتا دربار لگ گیا، اجمیر میں خواجہ معین الدین چشتی کی خانقاہ سج گئی، دہلی میں نظام الدین اولیاء کی محفل سماع جم گئی، ملتان میں بہاء الدین زکریا کی گدی بچھ گئی، پشاور میں رحمٰن بابا کی بصیرت نور پھیلانے لگی، بھٹ شاہ میں شاہ عبداللطیف بھٹائی کی نغمگی سرور پھیلانے لگی، سہون میں لعل شہباز قلندر کی دھمال گاہ رونق افروز ہو گئی، ناگپور میں بابا تاج الدین کی روحانیت جلوہ گر ہو گئی، علی گڑھ میں بابا برچھی بہادر کی درگاہ قلب کو تڑپانے لگی، اور کراچی میں عبداللہ شاہ غازی کی بارگاہ روح کو گرمانے لگی۔ غرض یہ کہ مسلمانوں کے دور حکومت میں عام طور سے امن اور خوش حالی کی فضا قائم ہو گئی تھی۔ پر خلوص مسلمانوں کی اس دینی فضا کو باقی رکھنے کے لئے مجدد الف ثانی نے براہین قاطعہ سے کام لیا اور شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ سے سہارا دیا۔ حقیقت پسند علمائے کرام کی محبت سے قوم کے افراد کے دلوں سے مذہبی تعصب اور علاقائی منافرت ختم ہو گئی اور اخوت و یگانگت کی فضا قائم ہو گئی۔

فلک کج رفتار کو مسلمانوں کا یہ سنہری زمانہ پسند نہ آیا اور اس نے مسلمانوں کو غلط راستوں پر ڈال دیا۔ لہٰذا مسلمانوں کی اس دینی فضا کو ان کی بد اعمالیوں نے نقصان پہنچایا اور ان کی عیاشی نے انہیں کہیں کا نہ رکھا۔ رفتہ رفتہ شمشیر و سناں کا تحفظ ختم ہو تا گیا، طاؤس و رباب کا اثر غالب آتا گیا، اور مسلمانوں کی غفلت شعاریاں بڑھتی گئیں۔ یہاں تک کہ ۱۸۵۷ء کا آغاز ہو گیا۔ اب جو مسلمانوں نے آنکھ کھول کر دیکھا تو اپنے آپ کو ان انگریزوں کا محکوم پایا جو صدیوں پہلے سات سمندر پار کر کے انگلستان سے ہندوستان میں تجارت کی غرض سے آئے تھے اور جنہوں نے یہاں کی طوائف الملوکی سے فائدہ اٹھا کر اپنی شیطانی سازشوں اور مقامی ضمیر فروشوں کی مدد سے آہستہ آہستہ پورے ہندوستان پر قبضہ جما لیا تھا۔ صرف چند ریاستیں باقی بچی تھیں جن کو خود انگریزوں نے اپنی سیاسی مصلحتوں کی وجہ سے قائم رکھا تھا۔ قلعۂ دہلی میں آخری مغل شہنشاہ ہند بہادر شاہ ظفر برائے نام تخت پر بیٹھا تھا اور اس کی عملداری صرف قلعۂ معلیٰ کی فصیلوں کے اندر ہی اندر تک چلتی تھی۔ قلعہ سے باہر چاروں طرف انگریزوں ہی کا عمل دخل تھا۔ انگریز خاص طور پر مسلمانوں سے پرخاش رکھتے تھے کیونکہ انہوں نے مسلمانوں ہی سے حکومت چھینی تھی۔ ہندوؤں سے انگریزوں کے تعلقات خوشگوار تھے کیونکہ ہندو انگریزوں کو اپنا نجات دہندہ سمجھتے تھے جنہوں نے انہیں مسلمانوں کی محکومیت سے آزاد کرایا تھا۔ بہت سے مسلمان مجبوراً اپنی عزت قائم رکھنے کے لئے یا اپنا پیٹ پالنے کے لئے انگریزوں کی ملازمتیں کرتے تھے لیکن ان کے دلوں میں انگریزوں سے اور ان کی انگریزی زبان سے نفرت بھری ہوئی تھی۔ بہت سے مولویوں نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ انگریزوں کے ساتھ کھانا پینا حرام ہے اور جو شخص انگریزی پڑھے گا وہ کافر ہو جائے گا۔ ادھر انگریز بھی مسلمانوں کو اپنا دشمن سمجھتے تھے اور مختلف طریقوں سے ان کی ذلت و خواری کے اسباب پیدا کرتے تھے۔ اس کے برخلاف ہندوؤں سے انگریز بہت خوش تھے اور انہیں بڑے بڑے عہدوں پر فائز کرتے تھے۔ ہندو بھی انگریزوں کی ملازمتوں پر فخر کرتے تھے اور بڑی خوشی سے انگریزی زبان اور مغربی علوم سیکھتے تھے۔ اس طرح دنیاوی لحاظ سے مسلمان پست سے پست تر

ہوتے جا رہے تھے اور بند و بلند سے بلند تر ہوتے جا رہے تھے۔

مصیبت بالائے مصیبت یہ ہوئی کہ تنگ آمد جنگ آمد کے مصداق ۱۸۵۷ء کے وسط میں مسلمانوں نے انگریزوں کے خلاف ہتھیار اٹھالئے اور ہر طرف سے یلغار شروع کر دی۔ اپنی کھوئی ہوئی سلطنت کو دوبارہ حاصل کرنے کے لئے مسلمانوں کی یہ آخری کوشش تھی جو اپنی ہی قوم کے ضمیر فروشوں کی غداری کی وجہ سے بری طرح ناکام ہو گئی اور اس جنگ آزادی کو غدر کا نام دیا گیا۔ اب تو انگریزوں کو اپنا انتقام لینے کا بہانہ مل گیا اور انہوں نے جگہ جگہ درختوں کی شاخوں پر مسلمانوں کے لئے پھانسی کے پھندے لٹکا دیئے۔ ہزاروں مسلمانوں کو بیدردی کے ساتھ تہہ تیغ کیا گیا۔ بڑی بڑی اعلیٰ حیثیت کے مسلمانوں کو سزائے موت دی گئی اور ان کی جائدادیں ضبط کر لی گئیں۔ مسلمانوں کی اس شکست فاش نے ان کی بربادی کی رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ ایسے پر ہول دور میں مسلم قوم کے ایک نامور سپوت سر سید احمد خاں نے اپنی قوم کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو مکمل غرقابی سے بچانے کے لئے کمر ہمت باندھی اور وہ اپنی جان کی پرواکئے بغیر دامے درمے سخنے اس کوشش میں منہمک ہو گیا کہ ہر قیمت پر قوم کی سیاسی، معاشی، اخلاقی، دینی اور تعلیمی حالت کو سدھارا جائے اور انہیں انگریز کے انتقام سے بچایا جائے۔ ہمت مرداں مدد خدا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے اس مرد مومن کی مدد فرمائی اور آخر کار وہ قوم کا مسیحا اپنی قوم کو پستی سے نکال کر بلندی کی طرف لے آیا۔ انجام کار سرسید کا خواب شرمندہ تعبیر ہوا اور ۱۹۲۰ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی وجود میں آگئی جس نے قوم کے نوجوانوں میں اتنا شعور اور حوصلہ پیدا کیا کہ انہوں نے علامہ محمد اقبال اور قائد اعظم محمد علی جناح کی آواز پر لبیک کہا اور نتیجۃً ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو وہ آزاد اسلامی مملکت خداداد وجود میں آگئی جس کا نام "پاکستان" ہے۔ اس مملکت کے قیام کے لئے مسلمانوں کو لاکھوں جانوں کی قربانی دینی پڑی، لاکھوں گھر بار لٹوانے پڑے، حتیٰ کہ لاکھوں کو ترک وطن کی صعوبتیں بھی اٹھانی پڑیں۔ اب یہ پاکستان مسلم قوم کے روشن مستقبل کے لئے ایک معتبر ضمانت ثابت ہو سکتا ہے بشرطیکہ اہل پاکستان مذہبی و صوبائی تعصبات اور دانستہ بداعمالیوں کے اسی قعر مذلت میں دوبارہ گر کر اپنی خودکشی کا ارادہ نہ کر لیں۔

سرسید کے خاندانی حالات

سرسید احمد خاں ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی میں پیدا ہوئے اور تقریباً ساڑھے اسی سال کی عمر پا کر ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو علی گڑھ میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کا اصل نام سید احمد تھا۔ خاں کا خطاب انھیں شہنشاہ دہلی نے عطا کیا تھا اور سر کا خطاب انھیں ملکہ برطانیہ نے دیا تھا اس طرح ان کا پورا نام سر سید احمد خاں ہو گیا تھا۔ وہ دہلی کے ایک مشہور سید گھرانے سے تعلق رکھتے تھے جن کے آباؤ اجداد ایران سے براستہ افغانستان، ہندوستان آئے تھے اور مغلیہ دربار سے منسلک ہو گئے تھے۔ شجرے کے لحاظ سے اگر حضرت محمد ﷺ کو پہلی پشت قرار دیا جائے تو جناب فاطمہ کے توسط سے سرسید کی اڑتیسویں پشت ہوتی ہے، اگر حضرت علیؓ کو پہلی پشت قرار دیا جائے تو سرسید کی سینتیسویں پشت ہوتی ہے اور اگر امام رضا کو پہلی پشت قرار دیا جائے تو سرسید کی اکتیسویں پشت ہوتی ہے یعنی سرسید امام رضا کی اکتیسویں پشت میں تھے، اس لئے رضوی تھے۔ سرسید کے نانا خواجہ فریدالدین احمد اعلیٰ قابلیت، انفرادی حیثیت اور مخصوص عہدوں کی وجہ سے دہلی کی مقتدر ہستیوں میں شمار ہوتے تھے۔ ان کا کتب خانہ سرسید کے بہت کام آیا۔ سرسید کے والد سید محمد متقی کے خاندانی مراسم مغلیہ دربار سے تھے۔ اس لئے سرسید بھی اپنی ابتدائی عمر میں مغلیہ دربار میں جاتے رہے لیکن بعد میں انھوں نے انگریزوں کی ملازمت اختیار کر لی۔ سرسید کی والدہ عزیزالنساء بیگم نہایت لائق، ذہین اور عالی دماغ خاتون تھیں۔ سرسید کی ابتدائی تعلیم و تربیت ان کی والدہ ہی نے کی تھی اس لئے بچپن ہی سے سرسید کو سچ بولنے کی عادت ہو گئی تھی۔ بزرگوں کا ادب، دشمن سے درگزر، مظلوموں کی امداد، خدا کی اطاعت، اور توہم پرستی سے اجتناب بھی سرسید کو ان کی والدہ ہی نے سکھایا تھا۔ ۱۸۳۸ء میں سرسید کے والد کا انتقال ہو گیا تھا اور ۱۸۵۷ء میں سرسید کی والدہ کا بھی انتقال ہو گیا۔

سرسید کے مورث اعلیٰ سید محمد دوست اورنگ زیب کی فوج میں ایک اعلیٰ افسر

تھے۔ انھیں اپنی تنہا بہادری کی وجہ سے "یکہ بہادر" کا خطاب ملا تھا۔ سید محمد دوست کے دو بیٹے تھے۔ سید محمد حنیفؔ اور سید محمد برہان۔ بڑے بیٹے سید محمد حنیفؔ ہجرت کر کے دہلی سے علی گڑھ میں جا بسے تھے جو اس زمانے میں "کول" کہلاتا تھا۔ چھوٹے بیٹے سید محمد برہان نے دہلی ہی میں سکونت قائم رکھتے ہوئے مغل دربار سے اپنی خاندانی وابستگی جاری رکھی تھی۔ سید محمد برہان کے بیٹے سید محمد عماد ہوئے، ان کے بیٹے سید محمد ہادی ہوئے، اور ان کے بیٹے سید محمد متقی ہوئے جو سرسید کے والد ماجد تھے۔ علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال نے سرسید کی روح کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے چودہ اشعار کی ایک نظم کہی تھی جس کا عنوان تھا "سید کی لوح تربت"۔ برصغیر کے مایہ ناز محقق خلیق احمد نظامی نے اپنی کتاب "سرسید آن ایجوکیشن، سوسائٹی اینڈ اکونومی" (مطبوعہ دہلی ۱۹۹۵ء) میں علامہ اقبال کی اس نظم "سید کی لوح تربت" کو بھی شائع کیا ہے اور اس نظم کے سامنے ہی سرسید کی اصلی لوح تربت کا فوٹو بھی شائع کیا ہے۔ اس فوٹو میں سرسید کی لوح تربت کا کتبہ بالکل صاف نظر آتا ہے جو ذیل میں درج ہے۔

"سرسید کی لوح تربت"

جواد الدولہ عارف جنگ ڈاکٹر سرسید احمد خاں بہادر

کے سی ایس آئی ایل ایل ڈی ابن سید متقی رضوی دہلوی

ولادت در دہلی پنجم ذی الحجہ ۱۲۳۲ ہجری

وفات در علی گڑھ چہارم ذیقعد ۱۳۱۵ ہجری

☆

سرسید کی مصروفیات

سرسید نے اٹھارہ سال کی عمر میں عربی و فارسی میں دسترس حاصل کر لی تھی، اور اردو تو ان کی مادری زبان تھی ہی۔ انگریزی زبان سے بھی تھوڑی بہت واقفیت ہو گئی تھی لیکن وہ انگریزی تقریریں بھی اردو رسم الخط میں لکھتے تھے۔ علم ریاضی سے بھی دلچسپی تھی۔ فقہ و فلسفہ سے بھی لگاؤ تھا۔ مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ، مفتی صدر الدین آزردہ، مولانا صہبائی، نواب ضیاء الدین خاں اور نواب مصطفیٰ خاں شیفتہؔ جیسے باکمال لوگوں کی صحبت نے انھیں ادیب اور شاعر بھی بنا دیا تھا۔ آہیؔ تخلص کرتے تھے اور بڑے بڑے استادوں کو اپنا کلام سناتے تھے۔ ۱۸۳۸ء میں ان کے والد کا انتقال ہو گیا اور اسی سال انھوں نے وقت کا تقاضا بھانپ کر ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت اختیار کر لی۔ اس کے ایک سال بعد ہی ان کی تصنیفی و تالیفی زندگی شروع ہوئی۔ سب سے پہلے انھوں نے اپنی کتاب "جام جم" لکھی جس میں امیر تیمور سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک کے حالات درج کیے ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے اپنی معرکۃ الآرا کتاب "آثار الصنادید" لکھی جس میں دہلی کی قدیم عمارتوں کا اور قدیم مقتدر ہستیوں کا ذکر کیا ہے۔ اس کتاب میں قدیم طرز کی پر تکلف اردو کا استعمال کیا ہے لیکن اس کے بعد کی مختلف تصنیفات و تالیفات میں انھوں نے صاف اور سادہ اردو زبان استعمال کی ہے۔ ۱۸۴۱ء میں انھوں نے منصفی کا امتحان پاس کیا اور مین پوری میں منصف مقرر ہو گئے۔ ۱۸۴۲ء میں فتحپور سیکری تبادلہ ہو گیا۔ اسی سال بہادر شاہ ظفر نے ان کو ان کا خاندانی خطاب جواد الدولہ عارف جنگ عطا کیا۔ ۱۸۴۶ء سے ۱۸۵۴ء تک دہلی میں رہے۔ ۱۸۵۵ء سے ۱۸۵۸ء تک بجنور میں رہے۔ اسی دوران یعنی ۱۸۵۷ء میں ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنی آخری جنگ آزادی لڑی جس میں انھیں ناکامی ہوئی۔ اسی سال ان کی والدہ کا انتقال ہوا۔ ۱۸۵۸ء سے ۱۸۶۲ء تک مراد آباد میں صدر الصدور کے عہدے پر فائز رہے۔ مراد آباد کے قیام کے دوران ہی ۱۸۵۸ء میں سرسید نے ایک جدید طرز کے مدرسے کی بنیاد ڈالی اور اس کا نصاب

بھی خود مرتب کیا۔ طلبہ کی تربیت کے لئے ایک کتابچہ بھی شائع کیا جس میں فارسی زبان کے ایک سو فقرے، صد پند لقمان کی طرز پر دیئے ہوئے تھے۔ جنہیں فقرات سرسید کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ یہی اسکول عملی طور پر سرسید کا پہلا تعلیمی کارنامہ تھا۔ یہ کام بعد میں علی گڑھ میں بھی جاری رہا۔ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ علی گڑھ تحریک کی اصل ابتداء مراد آباد میں ۱۸۵۸ء میں ہوئی تھی۔ مراد آباد ہی میں ۱۸۶۱ء میں سرسید کی بیوی پارسا بیگم کا انتقال ہوا جس سے سرسید کے دو بیٹے سید حامد اور سید محمود تھے اور ایک بیٹی بھی تھی۔ مراد آباد ہی میں سرسید نے اپنی کتاب "تاریخ سرکشی بجنور" لکھی اور مراد آباد ہی میں انہوں نے رسالہ "اسباب بغاوت ہند" لکھا جس میں ثابت کیا گیا تھا کہ ۱۸۵۷ء کے قتل و غارت گری میں مسلمان ملوث نہیں تھے بلکہ خود انگریزوں کی غلطیاں رنگ لائی تھیں۔

۱۸۶۲ء سے ۱۸۶۴ء تک سرسید غازی پور میں رہے۔ یہیں انہوں نے ۱۸۶۳ء میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کی جس نے مسلم قوم میں تحقیق و تجربہ کا شوق پیدا کر کے مغربی علوم حاصل کرنے کی ترغیب دی۔ یہ سوسائٹی بعد میں سرسید کے ساتھ ۱۸۶۴ء میں علی گڑھ آگئی۔ ۱۸۶۴ء سے ۱۸۶۷ء تک سرسید علی گڑھ میں رہے۔ یہیں ان کی ہمت افزائی علی گڑھ کے ایک باذوق، ہم کفو، علم دوست اور صاحب ثروت وکیل سید احمد حسین نے کی۔ انہوں نے سرسید کو یقین دلایا کہ وہ خاموشی کے ساتھ ان کی مالی اعانت کرتے رہیں گے۔ انہوں نے ہی سرسید کو یہ مخلصانہ مشورہ دیا تھا کہ وہ اپنی تعلیمی و اصلاحی سرگرمیوں کا مرکز علی گڑھ ہی کو بنائیں کیونکہ اس مقصد کے لئے علی گڑھ ہی کا مقام ہر لحاظ سے مفید رہے گا۔ سید احمد حسین وکیل کے دوست عنایت اللہ خاں آف بھیکم پور نے بھی اس تجویز کی پرزور تائید کی تھی۔ یہ تجویز سرسید کے دل کو بھاگئی اور انہوں نے علی گڑھ ہی کو اپنا مرکز بنانے کا تہیہ کرلیا۔ سرسید نے ۱۸۶۶ء میں علی گڑھ سے ہی علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کی اشاعت شروع کی جس نے مسلم قوم کی آواز سرکاری ایوانوں تک پہنچائی۔ علی گڑھ ہی سے انہوں نے اردو کی ترقی کے لئے ۱۸۶۷ء میں ورنیکلر یونیورسٹی قائم کرنے کے لئے حکومت کو لکھا لیکن

ہندوؤں نے اس کی سخت مخالفت کی اور کہا کہ صرف مسلمانوں کو اردو میں تعلیم دی جائے جب کہ ہندوؤں کو ہندی میں تعلیم دی جائے۔ گویا کہ دو قومی نظریہ سب سے پہلے خود ہندوؤں ہی نے پیش کیا تھا۔ اسی وقت سے سرسید کو یقین ہو گیا تھا کہ مسلمان اور ہندو بھی ایک ساتھ مل کر ہنسی خوشی نہیں رہ سکتے۔ علی گڑھ سے ان کا تبادلہ کچھ عرصے کے لئے بنارس ہو گیا تھا لیکن بعد میں وہ پھر علی گڑھ آگئے تھے۔ ۱۸۶۹ء میں وہ انگلستان گئے اور وہاں انہیں سی ایس آئی کا خطاب دیا گیا۔ ۱۸۷۰ء میں انگلستان سے واپسی ہوئی لیکن واپسی سے پہلے انہوں نے اپنی کتاب "خطبات احمدیہ" شائع کی جس میں سر ولیم میور کی شرانگیز و دل آزار کتاب "لائف آف محمد" کا منہ توڑ جواب دیا گیا تھا۔ واپسی کے بعد اسی سال انہوں نے رسالہ تہذیب الاخلاق جاری کیا جس میں مسلمانوں کے سماجی و اخلاقی و مذہبی خیالات کی اصلاح کے لئے مضامین شائع ہوتے رہتے تھے۔ ۱۸۷۱ء میں ڈاکٹر ہنٹر کی مسلم کش کتاب "اور انڈین مسلمانز" کی تکذیب میں اپنی کتاب شائع کرائی۔

سرسید دن رات مسلمانوں کی حمایت میں لڑتے رہے اور ان کے لئے تعلیمی و اصلاحی کام کرتے رہے۔ اپنی علی گڑھ تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے نہ جانے کتنی تقریریں کیں، نہ جانے کتنی تحریریں شائع کرائیں، نہ جانے کتنے ادارے قائم کئے اور نہ جانے کتنے اجلاس کئے۔ کس کس ڈھنگ سے سرمایہ جمع کیا، کہاں کہاں جا کر چندہ وصول کیا، اور کیسے کیسے لوگوں کے در پر بھیک مانگی۔ اپنے خلاف طرح طرح کے الزامات کا مقابلہ کرنا پڑا، یہاں تک کہ اپنے خلاف کفر کے فتوے بھی سننے پڑے۔ لیکن سرسید نے ہمت نہ ہاری۔ اپنی دھن میں لگے رہے۔ آخر کار ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو علی گڑھ میں سرسید نے "محمڈن اینگلو اورینٹل اسکول" قائم کر دیا۔ وہی اسکول ۱۸۷۷ء میں "ایم اے او کالج" میں تبدیل ہو گیا، اور وہی کالج ۱۹۲۰ء میں "علی گڑھ مسلم یونیورسٹی" میں تبدیل ہو گیا۔ اسی ترقی کے متعلق علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن پاکستان کراچی کے صدر جناب ظل احمد نظامی نے ماہنامہ تہذیب کراچی کے مارچ ۱۹۹۳ء کے شمارے میں لکھا تھا "اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے اور سرسید

اور ان کے رفقائے کار کی کاوشوں سے ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو اسکول کا سنگ بنیاد رکھا گیا جس میں چار طلبہ نے داخلہ لیا۔ سرسید کو جنت الفردوس میں یہ معلوم کر کے کتنی خوشی ہو گی کہ جس ادارہ کو انہوں نے چار طلبہ سے شروع کیا تھا آج اس میں چوبیس ہزار طلبہ تعلیم پا رہے ہیں۔"

ایم اے او کالج کے افتتاح کے ایک سال بعد ۱۸۷۶ء میں ہی سرسید علی گڑھ ہی سے جج کے عہدے سے ریٹائر ہو گئے اور اپنی پوری زندگی قومی خدمات کیلئے وقف کر دی۔ ۱۸۷۸ء میں وائسرائے کی کونسل میں نامزدگی ہوئی۔ ۱۸۸۲ء میں ایجوکیشن کمیشن کے ممبر ہوئے۔ ۱۸۸۶ء میں سرسید نے "محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس" قائم کی جس نے سرسید کے بعد بھی بڑے بڑے کارہائے نمایاں سرانجام دیئے اور پوری قوم میں تعلیمی روح پھونک دی۔ ۱۸۸۷ء میں پبلک سروس کمیشن کی رکنیت ملی۔ ۱۸۸۸ء میں سر کا خطاب ملا۔ ۱۸۸۹ء میں ایڈنبرا یونیورسٹی کی جانب سے ڈاکٹر آف لا کی اعزازی ڈگری دی گئی۔ جولائی ۱۸۹۵ء میں سرسید کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا صدمہ یہ پہنچا کہ کالج کے ہیڈ کلرک شام بہاری لال نے ایک لاکھ روپے سے زیادہ کا غبن کر لیا اور پھر اس نے حوالات میں جا کر خودکشی کر لی۔ جس سرمائے کو سرسید نے پیسہ پیسہ کر کے جمع کیا تھا وہ اس طرح ضائع ہو گیا۔ اس صدمہ نے انہیں بالکل نڈھال کر دیا اور ان کی صحت تیزی سے گرنے لگی۔ اور بھی کئی ناگفتہ بہ صدمے ان پر پے بہ پے گزر گئے۔ سرسید نے ۱۸۸۰ء میں تفسیر قرآن کی اشاعت کا کام شروع کر دیا تھا تاکہ یہ ثابت کیا جا سکے کہ تمام قرآنی مندرجات نظام فطرت کے عین مطابق ہیں۔ انہوں نے یہ کام اپنی زندگی کے آخری لمحے تک کیا لیکن جب صرف ۲/۵ حصہ کام باقی رہ گیا تو انہیں پیغام اجل آ گیا اور وہ ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو علی گڑھ میں انتقال کر گئے۔ دوسرے دن انہیں کالج کی مسجد کے احاطے میں دفن کر دیا گیا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

☆

علی گڑھ تحریک کے اغراض ومقاصد

سرسید کی علی گڑھ تحریک کا اصل مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کے خیالات میں وسعت پیدا کی جائے تا کہ وہ ترقی کی دوڑ میں اقوام عالم کے دوش بدوش چل سکیں۔ سرسید کا فلسفہ تھا "زمانہ با تو نسازد تو بازمانہ بساز" یہی فلسفہ ترقی کر کے علامہ اقبالؔ کے دور میں یہ ہو گیا "زمانہ با تو نسازد تو بازمانہ ستیز" سرسید چاہتے تھے کہ علوم جدیدہ اور روایات اسلامیہ کا ایک امتزاج پیدا ہو جائے اور مسلم نوجوان اس قابل بن سکیں کہ وہ ملک کی کھلی فضا میں زندگی کی جدوجہد میں بھرپور حصہ لے سکیں، اور تمام حوادثات کا مردانہ وار مقابلہ کر سکیں۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کے بچے اتنے تربیت یافتہ ہو جائیں کہ ان میں کوئی دینی یا اخلاقی کمزوری باقی نہ رہے تا کہ وہ بچے ایک نئی ترقی یافتہ مسلمان نسل بن کر ابھر سکیں۔

سرسید کی یہ دلی خواہش تھی کہ مسلمان نوجوان انگریزوں کے ترقی یافتہ طور طریقے دیکھیں اور اگر اسلامی نقطہ نظر سے ان میں کوئی قباحت نہ ہو تو انہیں اختیار کریں، لیکن اپنے دو قومی نظریئے سے ہر وقت خبردار رہیں اور اپنے حقوق کو غصب نہ ہونے دیں۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلم لڑکے توہمات کو ذہن سے نکالیں، مذہب کا صحت مندانہ تصور اپنائیں، جدید علوم حاصل کریں، سائنس کے اصولوں سے واقفیت حاصل کریں، اور خدا کی دی ہوئی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اپنی زندگیوں کو خوشگوار بنائیں۔ ان کی تمنا تھی کہ مسلمان دنیا میں اپنا وقار قائم کریں اور زمین کا بوجھ بننے کے بجائے نوع انسانی کیلئے رحمت ثابت ہوں اور اپنی قوم کے مددگار بنیں۔

سرسید کی انہی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ مختلف مراحل سے گزر کر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی قائم ہو گئی۔ اس علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ہی کا یہ فیض ہے کہ آج پورے برصغیر پاک وہند میں بلکہ پوری دنیا میں مسلمان تعلیم یافتہ نظر آتے ہیں۔ علی گڑھ کے فرزندوں اور سرسید کے سپوتوں نے دور دور تک اجالا پھیلایا ہے اور ہر طرف علم ودانش کی شمعیں روشن

کی ہیں۔ دنیا کے ہر بڑے شہر میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن قائم ہے جو نئے نئے تعلیمی کام انجام دے رہی ہے۔ کراچی میں بھی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن آف پاکستان ۱۹۴۸ء سے قائم ہے اور مسلمانوں کے بچوں میں علم کی روشنی پھیلا رہی ہے۔ اس ایسوسی ایشن نے ۱۹۸۹ء میں علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی قائم کیا، پھر ۱۹۹۳ء میں سرسید یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی قائم کی۔ پھر ۱۹۹۵ء میں فہیم النساء میموریل علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی فار گرلز قائم کیا۔ ابھی اور بھی دیکھئے کہ آئندہ یہ ایسوسی ایشن کیا کیا کارنامے انجام دیتی ہے۔ سرسید کے اغراض ومقاصد بھی یہی تھے کہ مسلمان نوجوان دنیا میں نام پیدا کریں اور باعزت زندگی گزاریں۔

علی گڑھ تحریک کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ مسلمان نوجوانوں کو اپنے دین اسلام کی صحیح واقفیت ہو جائے اور وہ غیروں کے بہلانے پھسلانے سے اپنے مذہب سے نفرت نہ کرنے لگیں۔ اس خطرے سے مقابلہ کرنے کے لئے سرسید نے جو تدبیر اختیار کی اس کا ذکر وہ اس طرح کرتے ہیں "انگریزوں نے مسلمان بادشاہوں اور مسلمان حکومتوں کی تاریخیں نہایت ناانصافی اور تعصب سے لکھی ہیں اور کوئی برائی نہیں جو مسلمانوں کی طرف منسوب نہ کی ہو۔ ہماری قوم کے جوان لڑکے انگریزی میں انہی تاریخوں کو پڑھتے ہیں اور دیکھتے ہیں، جس سے بڑا نقص پیدا ہوتا ہے اور جو بات کہ ازراہِ ناانصافی اور تعصب کے مسلمانوں کی نسبت لکھی گئی ہے اس کو وہ سچ اور واقعی سمجھتے ہیں۔ اس لئے ایسی قسم کی انگریزی کتابوں کا پیدا ہونا جن میں مسلمانوں کا حال نہایت سچائی اور انصاف سے لکھا ہو نہایت مفید بلکہ ضروری ہے۔" اس ضمن میں انہوں نے جان ڈیون پورٹ کی کتاب "اپالوجی فار محمدؐ اینڈ قرآن" کو اپنے روپیہ سے شائع کرایا کیونکہ یہ اسلام کی حمایت میں لکھی گئی تھی۔ بعد میں اس کتاب کا اردو ترجمہ بھی شائع کیا۔ اس کتاب کے متعلق سید مہدی علی کو ایک خط میں اس طرح لکھتے ہیں "جس کتاب کے چھاپے ہونے کا اشتہار میں نے بھیجا تھا وہ تمام ہو گئی ہے۔ ہفتہ یا دو ہفتہ کے بعد اس کے نسخے آپ کے پاس بھیجوں گا۔ آپ دیکھیں گے کہ مصنف نے کیسا انصاف اور کیسا

پیچ اختیار کیا ہے۔ گو بعض خیالات اس کے ہمارے خیالات کے مطابق نہ ہوں۔ وہ مسلمان نہیں ہے، انگریز ہے۔ جب آپ اس کی کتاب دیکھیں گے تو جانیں گے کہ وہ انگریز ہزاروں مسلمانوں سے بہتر ہے۔" سرسید نے اسی انگریز سے دو مزید کتابیں لکھوانے کا منصوبہ بنایا تھا جن میں مسلمانوں کی نیک نامی ثابت کی جائے۔ ایک کتاب "فتح اندلس" پر اور دوسری کتاب "صلیبی جنگ" پر۔ ان دو کتابوں کے متعلق سرسید نے سید مہدی علی کو انگلستان سے لکھا تھا کہ "ان دونوں کتابوں کے چھپنے اور تیار ہونے میں آٹھ سو روپیہ تخمیناً صرف ہوگا۔ فی کتاب چار سو روپیہ۔ پس میں چاہتا ہوں کہ آپ وہاں کے احباب سے آٹھ سو روپیہ چندہ کر کے میرے پاس بھیج دیں۔ چندہ کرنے میں شہرت نہیں چاہئے، صرف احباب مخلص سے چندہ ہو۔"

اسی طرح انگلستان کے ایک قابل مصنف گاڈ فرے ہجز کی ایک نایاب کتاب کو جو اسلام کی تائید میں لکھی گئی تھی سرسید نے لندن میں ایک جرمن کتاب فروش سے دس گنی قیمت میں خرید ا اور ہندوستان واپس آکر پانچ سو روپیہ خرچ کر کے اس کا اردو ترجمہ "حمایت اسلام" کے نام سے شائع کرایا۔ اسی طرح پروفیسر آرنلڈ کی کتاب "پریچنگ آف اسلام" کا ترجمہ سرسید نے کرایا اور اس کے متعلق اپنے ایک خط میں لکھا کہ "میں اس کتاب کو مسلمانوں کے لئے نہایت مفید سمجھتا ہوں۔ میری اور میرے دوستوں کی رائے ہے کہ مسلمان انگریزی خواں طالب علم جو گورنمنٹ کالجوں اور مشنری کالجوں میں پڑھتے ہیں ان کو یہ انگریزی کتاب بلا قیمت دی جائے۔" اسلام کے خلاف ولیم میور کی کتاب "دی لائف آف محمدؐ" کے جواب میں جب سرسید اپنی کتاب "خطبات احمدیہ" شائع کرانا چاہتے تھے تو اس کے لئے اپنے ایک خط میں انگلستان سے لکھا کہ "اب بجز روپیہ کے کسی چیز کی فکر نہیں۔ کتابیں اور میرا اسباب یہاں تک کہ میرے ظروف مسی تک فروخت کر کے ہزار روپیہ بھیج دو۔ کیا کہئے اس کتاب کے پیچھے خواب و خور حرام ہو گیا ہے۔ خدا مدد کرے۔"

ایک طرف تو سرسید اسلام کے مخالفین سے نبرد آزما تھے اور دوسری طرف خود مسلمانوں کے ان کچے عقائد کی بیخ کنی کر رہے تھے جن کی وجہ سے نوجوان اسلام سے متنفر

ہوتے جارہے تھے۔ اسی قسم کے ایک مضحکہ خیز عقیدہ کی نشاندہی مولانا حالیؔ نے اس طرح کی ہے۔ "ایک دفعہ ہمارے سامنے یہ واقعہ گزرا کہ عید الفطر سے پہلے ایک عالم نے وعظ میں یہ روایت بیان کی کہ عید کے روز روئے زمین پر ہر شہر میں خدا تعالیٰ علی الصباح اپنے فرشتوں کو بھیجتا ہے اور وہ زمین پر اتر کر ہر ایک بستی کے گلی کوچوں میں منادی کرتے ہیں جس کو تمام مخلوقات سوائے جن و انسان کے سنتی ہے اور بلند آواز سے کہتے ہیں کہ اے امت محمد یہ اس خدا کی طرف چلو جو بڑا بخشش والا اور بڑے بڑے گناہ معاف کرنے والا ہے۔ اس وقت اتفاق سے کچھ انگریزی تعلیم یافتہ نوجوان مسلمان بھی تھے۔ جب وعظ ہو چکا تو مسجد سے باہر نکل کر ان میں سے اکثر طلبہ اس روایت پر ہنستے تھے اور ایک دوسرے سے کہتے تھے کہ عجب تماشا ہے جن کو عید گاہ میں بھیجنا منظور ہے وہ تو سن نہیں سکتے اور تمام نباتات و جمادات و حیوانات سنتے ہیں۔ پھر اگر ہم لوگ عید گاہ میں نہ جائیں تو ہمارا کیا قصور ہے۔"

☆

علی گڑھ تحریک کی کامیابی

سرسید نے علی گڑھ تحریک کی ابتداء کچھ ایسے خلوص دل سے کی تھی کہ ہزاروں مشکلوں اور مخالفتوں کے باوجود اللہ تعالیٰ نے انھیں ہر محاذ پر کامیابی بخشی۔ علی گڑھ تحریک صرف تعلیمی ہی نہیں تھی بلکہ یہ ہمہ جہت تحریک تھی۔ سرسید نے طلبہ کے ڈسپلن اور یونیفارم کا خاص خیال رکھا تھا۔ کالی شیروانی اور ترکی ٹوپی علی گڑھ تحریک کی پہچان بن گئی تھیں۔ مذہبی ہم آہنگی اور دینی رواداری کا یہ عالم تھا کہ علی گڑھ کی پوری درسگاہ میں صرف ایک ہی مسجد تھی جہاں شیعہ اور سنی ایک ہی جگہ نماز پڑھتے تھے۔ عیدبقر عید کی نمازیں بھی اسی مسجد میں ہوتی تھیں۔ پہلے سنیوں کی نماز ہوتی تھی پھر شیعوں کی نماز ہوتی تھی۔ مزاح کے طور پر ان نمازوں کو فرسٹ شو اور سیکنڈ شو کہا جاتا تھا۔ اگر کبھی کسی سیکنڈ شو والے کو جلدی ہوتی تھی تو وہ فرسٹ شو میں شریک ہو جاتا تھا اور اگر کبھی کوئی فرسٹ شو والا لیٹ ہو جاتا تھا تو وہ سیکنڈ شو میں شریک ہو جاتا تھا۔ سنی دینیات اور شیعہ دینیات کے علیحدہ علیحدہ شعبے قائم تھے لیکن کبھی سنی طلبہ شیعہ دینیات کی کلاس میں چلے جاتے تھے اور کبھی شیعہ طلبہ سنی دینیات کی کلاس میں چلے جاتے تھے۔ یہ ایک ایسا مثالی درس تھا جس نے ملت اسلامیہ کو ایک ملت واحدہ ثابت کر دیا تھا۔ اس کے اثرات آگے تک بھی پھیلے اور ۱۹۰۵ء میں روسی علمائے دین نے آذربائجان میں کانفرنس کر کے یہ طے کیا کہ پانچوں فقہ والے مسلمان ایک ہی مسجد میں نماز پڑھا کریں گے۔ آخر حج کے موقع پر بھی تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ پھر باقی دنوں میں بھی ایسا کیوں نہیں ہو سکتا؟ علی گڑھ میں ایم اے او کالج قائم ہوتے ہی پورے ہندوستان میں مسلمانوں میں تعلیمی بیداری نظر آنے لگی اور آہستہ آہستہ حیدرآباد دکن میں عثمانیہ کالج قائم ہوا۔ پشاور میں اسلامیہ کالج قائم ہوا، کراچی میں سندھ مدرسۃ الاسلام قائم ہوا۔ ان اداروں کے علاوہ اور بھی بہت سے مقامات پر مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کے مراکز کھل گئے اور مجموعی طور مسلمان پستی سے بلندی کی طرف گامزن ہو گئے۔

سرسید کی علی گڑھ تحریک سے مسلمانوں میں جو فرسودہ رسم و رواج چلے آرہے تھے ان کی بیخ کنی ہوئی، بے جا مذہبی تعصبات اور فرقہ وارانہ منافرت دور ہوئی، بد اخلاقی اور بے راہ روی کا خاتمہ ہوا، انگریزی زبان اور مغربی علوم سے اجنبیت جاتی رہی۔ مروجہ صنعت و حرفت کی طرف رغبت ہوئی، ماحول کو سازگار بنانا سیکھ لیا، اقوام عالم کے علوم و فنون سے فائدہ اٹھانا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ اردو نظم و نثر میں بھی غیر ضروری عبارت آرائی اور لفاظی سے نجات حاصل کر کے سادگی و سلاست کو اپنا لیا گیا۔ سرسید کے مضامین، خواجہ حالی کا مسدس، اور میر عتیق کی اخلاقی شاعری، یہ سب کچھ علی گڑھ تحریک ہی کے ثمرات تھے جو آگے بڑھ کر علامہ اقبال کی قومی شاعری اور قائد اعظم محمد علی جناح کی قومی تقریروں میں تبدیل ہو گئے۔ سرسید کی اسی تحریک نے مسلمانوں میں وہ اہلیت پیدا کی کہ انہوں نے ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو اپنے خون سے اپنے لئے ایک علیحدہ آزاد اسلامی ملک "پاکستان" بنا لیا۔ یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہئے کہ پاکستان سرسید کی علی گڑھ تحریک کی بدولت وجود میں آیا ہے اور اس پاکستان کو قائم رکھنے کے لئے بھی سرسید کی علی گڑھ تحریک کو جاری رکھنے کی اشد ضرورت ہے۔ علی گڑھ تحریک نور ہدایت کا ایک ایسا مینار ہے جو مسلم قوم کو زندگی کی دوڑ میں آگے ہی آگے بڑھنے کا حوصلہ دیتا رہے گا، دینی امور میں اجتہاد کی ضرورت پر زور دیتا رہے گا اور عملی جدوجہد میں خود احتسابی کا سبق پڑھاتا رہے گا۔ علی گڑھ تحریک زندہ باد، علی گڑھ پائندہ باد۔

اے علی گڑھ، اے جواں قسمت دبستان کہن
اے کہ فکر شعر سے تابندہ تیری انجمن
تیرے پیمانوں میں لرزاں ہے شراب علم و فن
حشر کے دن تک پھلا پھولا رہے تیرا چمن

ہر زمانے میں رہیں شاداب تیرے برگ و بار
ہر گھڑی سایہ فگن تجھ پر رہے ابر بہار

ارشاداتِ سرسید

(۱) سرسید کی علی گڑھ تحریک کا سب سے پہلا سرمایہ امام ضامن کا ایک روپیہ تھا جس نے اتنی برکت پیدا کی کہ بعد میں وہ سرمایہ لاکھوں روپوں تک پہنچ گیا۔ خود سرسید نے لکھا ہے:۔

"مجھے وہ دن خوب یاد ہے کہ میں نے ایک دوست کے بازو پر حضرت امام ضامن کی نیاز کا روپیہ بندھا ہوا دیکھا تو میں نے سوال کیا کہ کیا مسلمان قوم سے زیادہ اور کوئی قوم محتاج ہے ؟ ان الفاظ سے میرے دوست کے دل پر اثر ہوا اور وہ سبز کپڑا جس میں وہ نذر بندھی ہوئی تھی انھوں نے مجھ کو دیا۔ جب اس کو کھولا تو ایک روپیہ اور دو منصوری پیسے اس میں سے نکلے اور یہ پہلا سرمایہ تھا جو ہماری کمیٹی کے خزانے میں ڈالا گیا۔ آج نہایت خوشی کا مقام ہے کہ کمیٹی کے پاس سرمایہ اور آمدنی ساڑھے تین لاکھ روپے کے مساوی موجود ہے۔"

(۲) سرسید نے اپنی علی گڑھ تحریک کی عملی جدوجہد کے بنیادی اصول کو اس طرح بیان کیا ہے جو بعد میں بالکل صحیح ثابت ہوا:۔

"جس شخص کے دل میں اصلاح و ترقی کا خیال ہو اس کو چاہئے کہ خود نہایت استقلال اور مضبوطی اور بہادری سے تمام قوم سے اختلاف کرے اور اس رسم کو توڑے یا اس میں اصلاح و ترقی کرے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ تمام قوم اس کو برا کہے گی اور بنکو بنائے گی، مگر پھر رفتہ رفتہ لوگ اس کی پیروی کرنے لگیں گے۔ اور جس طرح کہ اولاً ہدف تیر ملامت ہوا تھا انجام کو وہی سب کا ہادی اور پیشوا اور مصلح قوم شمار کیا جاوے گا۔"

(۳) سرسید کی نظر میں تعلیم سے بھی زیادہ ضروری تربیت ہے۔ انھوں نے کہا:۔

"ہم کو مسلمانوں کے لئے تعلیم سے زیادہ وہ چیز کرنی چاہئے جس کو ہم تربیت کہتے ہیں اور جو قوم کو قوم بننے کے لئے ایسی ہے جیسی جان بدن کیلئے اور بغیر اس کے قوم کا قوم بننا

محالات سے ہے۔"

(۴) سرسید نے مسلم قوم کی اصل ماہیت کو اس طرح سمجھایا تھا:۔

"اسلام نے اس قومیت کے بدلے جو نسل یا ملک کے سبب گنی جاتی تھی اسلامی قومیت قائم کی ہے۔ جس نے کلمہ پڑھا خواہ چین کا ہو یا ماچین کا، عرب کا رہنے والا ہو یا ہندوستان کا، سب آپس میں بھائی اور مسلمان ہیں اور ایک قوم۔ اور یہ ایسا افتخار ہے کہ سوائے اسلام کے اور کسی میں نہیں پایا جاتا۔ پس ہم کو اس بات کی فکر ہے کہ ہماری قوم قوم بنے اور معزز قوم بنے۔"

(۵) سرسید اپنی قوم کے افراد کو اسلام سے الگ کر کے نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کو یقین تھا کہ اسلام سے ہٹ کر ہماری حیثیت صفر کے برابر ہے۔ انہوں نے بتایا:۔

"اے عزیزو! اگر کوئی آسمان کا تارا ہو جائے مگر مسلمان نہ رہے تو ہم کو کیا۔ وہ ہماری قوم ہی میں نہ رہا۔"

(۶) سرسید کے نزدیک اس زمانے کے مسلمانوں کے اصل مسائل کیا تھے اور ان کا حل کیا تھا، یہ سب کچھ خود سرسید سے سنئے:۔

"میں نے اپنی قوم کی تباہی، پستی اور مایوسی کے اسباب پر غور کیا تو اس نتیجے پر پہنچا کہ اوّل ہماری قوم میں تعلیم و تربیت کی کمی ہے، دوم انگریزوں سے جنہیں خدا نے ہم پر مسلط کیا ہے ہماری قوم کو نفرت ہے۔ لہٰذا میں نے ان دو اصولوں پر کام کرنا شروع کیا۔ ایک قوم کی تعلیم و تربیت، دوسرے حکمرانوں سے اعلیٰ اتحاد و دوستی۔"

(۷) سرسید کی مذہبی اصلاح کا بنیادی اصول یہ تھا کہ تمام فرقوں میں جو باتیں مشترک ہوں بس انہیں باتوں پر اتحاد و اتفاق ہو جانا چاہئے اور اختلافی باتوں کو زیادہ اہمیت نہ دینی چاہئے۔ جالندھر میں ایک بہت بڑے مجمع کو مخاطب کر کے کافی طویل تقریر کی اور کہا:۔

"اسلام ایک لازوال نور ہے جو ہمیشہ سے روشن ہے اور ہمیشہ روشن رہے گا۔ اسلام

خود خدا کا نور ہے جو مثل اس کی ذات کے ازلی و ابدی ہے۔ یہی نور اسلام آدم کے سینے میں تھا، اسی نور اسلام نے نوح اور شیث اور یعقوب و ابراہیم، موسیٰ و یحیٰ و عیسیٰ تمام انبیاء علیہم السلام کے دلوں کو منور کیا تھا۔ یہی نور اسلام ہے جو فاران کے پہاڑ پر چمکا اور اسمٰعیل کے دل میں اترا اور اس کنکریلی ریتیلی زمین کو منور کیا جس کو ہم عرب یا حجاز کہتے ہیں۔ وہیں اس نے اپنا گھر بنایا ..... اسی نور نے آخر کار سینہ مبارک محمد رسول اللہ ﷺ سے ظہور کیا۔ وہ نور نہ کسی خاص قوم کے لئے مخصوص تھا نہ کسی خاص ملک کے لئے، وہ تمام دنیا کے لئے روشنی تھا اور روشنی ہے اور روشنی رہے گا۔ ہر ایک مسلمان کے سینے میں وہی نور ہے۔ اس میں نہ کبھی تغیر ہوا ہے نہ ہوگا۔ اختلاف فرق سے، جو مذہب اسلام میں دکھائی دیتے ہیں، اس نور میں کچھ نقصان نہیں آتا۔ تھوڑی دیر کے لئے اسلام کے تمام مختلف فرقوں کا تصور کرو اور تمام مختلف باتوں کو یا مسئلوں کو حذف کرتے جاؤ، حذف کرتے کرتے بہت کچھ باقی رہ جائے گا جس پر سب فرقے متحد ہوں گے۔ پس وہی نور اسلام ہے جو باوصف اختلافات کے سب میں بلا نقصان کے منور ہے۔"

(۸) سرسید کی دلی خواہش تھی کہ وہ مسلمانوں کو آسمان کی بلندی سے بھی اونچا پہنچا دیں۔ اسی لئے وہ دن رات محنت کر کے قوم کے نونہالوں کی تعلیم و تربیت کا بندوبست کرتے رہتے تھے وہ کہتے تھے "میں اپنی قوم کو آسمان کی مانند کرنا چاہتا ہوں، جو رات کے وقت ہم کو دکھائی دیتا ہے۔ جب میں رات کو آسمان دیکھتا ہوں تو میں اس کے اس حصہ کی، جو نیلا نیلا سیاہ اور ذرا اونادکھائی دیتا ہے، کچھ بھی پروا نہیں کرتا۔ مگر ان ستاروں کو دیکھنا چاہتا ہوں جو اس میں چمک رہے ہیں اور معشوقانہ انداز کی چمک سے ہم کو اپنی طرف کھینچتے ہیں اور جس کے سبب اس تمام سیاہ رو آسمان کو بھی عجیب قسم کی خوبصورتی حاصل ہوئی ہے۔ اے صاحبو! کیا تم اپنی قوم میں اس قسم کے لوگ پیدا کئے بغیر، جو تمہاری قوم میں ایسے ہی چمکتے ہوں جیسے آسمان پر تارے، اپنی قوم کو معزز اور دوسری قوموں کی آنکھ میں باعزت بنا سکتے ہو؟"

☆

سرسید کا دو قومی نظریہ

یہ حقیقت سب پر عیاں ہے کہ اگر ہندوستان میں دو قومی نظریہ پیش نہ کیا جاتا تو ہندوستانی مسلمان ہندوؤں کے فریب میں آکر ان کی غلامی میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مبتلا ہو جاتے۔ اس دو قومی نظریئے ہی کا منطقی نتیجہ تھا کہ مسلمانوں نے اپنے تشخص کو پہچانا اور سیاسی جدوجہد کر کے ایک علیحدہ آزاد ملک "پاکستان" بنالیا۔ یہ دو قومی نظریہ سب سے پہلے سرسید ہی نے پیش کیا تھا اور اسی کی بنیاد پر انہوں نے مسلمانوں کو انڈین نیشنل کانگریس سے دور رہنے کی تلقین کی، حالانکہ شروع میں سرسید کانگریس کے حامی تھے لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ ہندو اپنے تعصب کو ہرگز نہیں چھوڑ سکتے تو پھر انہوں نے مسلمانوں کو ہندوؤں کے مقابلہ پر لاکر مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کی کوششیں شروع کر دیں۔ انہوں نے کہا "پہلا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ مسلمانوں کی قومیت کا تصور اور قومی اتحاد جو ترقی کی راہ میں پہلا قدم ہے برقرار رہنا ضروری ہے۔" جب سرسید نے کانگریس سے بیزاری کا اظہار کیا تو کانگریس کے بانی مسٹر ہیوم نے بڑے تعجب سے کہا کہ "مجھ کو نیشنل کانگریس کا خیال صرف سید احمد کی کتاب اسباب بغاوت ہند کو دیکھ کر پیدا ہوا تھا مگر میں نہیں جانتا کہ اب اس کو کیا ہو گیا۔" اسی دو قومی نظریئے کی بنیاد پر سرسید نے مدرسۃ العلوم قائم کیا جو بعد میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی شکل میں ابھرا اور جس نے مسلمانوں میں تعلیم و تربیت و آزادی کا شعور پیدا کیا۔ اسی ملی شعور نے مولانا حالیؔ اور علامہ اقبالؔ کو بصیرت بخشی اور پھر اسی دو قومی نظریئے کو بنیاد بنا کر قائداعظم محمد علی جناح نے مسلمانوں میں سیاسی بیداری پیدا کی اور ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور میں قرارداد پاکستان پاس کرائی، اور پھر ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو مملکت خداداد پاکستان وجود میں آگئی لیکن یہ پاکستان بھی ہماری آخری منزل نہیں ہے بلکہ علامت منزل ہے۔ سرسید کی علی گڑھ تحریک کے مطابق ہماری منزل ابھی اور آگے ہے۔

سرسید نے ۲۸ دسمبر ۱۸۸۷ء کو نیشنل کانگریس میں شرکت کے خلاف اعلان

کر دیا تھا اور اس کے مقابلہ کے لئے پیٹریاٹک ایسو سی ایشن قائم کر دی تھی۔ سرسید کی ساری جدوجہد صرف اپنی قوم کی خاطر تھی اور اپنی ذاتی منفعت کا کوئی خیال نہیں تھا۔ اس کا ثبوت اس واقعہ سے بھی ملتا ہے جس کا ذکر خود سرسید نے کیا ہے۔ دراصل ۱۸۵۷ء کی شورش کے زمانہ میں جب کہ سرسید بجنور میں متعین تھے انھوں نے بیس انگریزوں کی جانیں بچائی تھیں جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے۔ اس کے بعد جب انگریزوں کی عملداری دوبارہ شروع ہوئی تو سرسید کو اس کا کچھ معاوضہ انگریزوں نے دینا چاہا لیکن انھوں نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ خود کہتے ہیں کہ "بعوض اس وفاداری کے تعلقہ جہاں آباد جو سادات کے ایک نامی خاندان کی ملکیت اور لاکھ روپیہ سے زیادہ ملکیت کا تھا مجھ کو دینا چاہا تو میرے دل کو نہایت صدمہ پہنچا۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ مجھ سے زیادہ کوئی نالائق دنیا میں نہ ہوگا کہ قوم پر تو یہ بربادی ہو اور میں ان کی جائداد لے کر تعلقہ دار بنوں۔ میں نے اس کے لینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ میرا ارادہ ہندوستان میں رہنے کا نہیں ہے اور درحقیقت یہ بالکل سچ بات تھی۔ میں اس وقت ہرگز نہیں سمجھتا تھا کہ قوم پھر پنپے گی اور کچھ عزت پائے گی اور جو حال اس قوم کا تھا مجھ سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔ چند روز میں اسی خیال اور غم میں رہا۔ آپ یقین کیجئے کہ اس غم نے مجھے بڈھا کر دیا اور میرے بال سفید کر دیئے۔ جب میں مراد آباد آیا جو ایک بڑا غمکدہ ہماری قوم کے رئیسوں کی بربادی کا تھا تو اس غم کو اور ترقی ہو گئی مگر اس وقت یہ خیال پیدا ہوا کہ نہایت نامردی اور بے مروتی کی بات ہے کہ اپنی قوم کو تباہی کی حالت میں چھوڑ کر میں خود کسی گوشۂ عافیت میں جا بیٹھوں۔ نہیں، اسکی مصیبت میں شریک رہنا چاہئے اور جو مصیبت پڑے اس کو دور کرنے میں ہمت باندھنا قومی فرض ہے۔ میں نے ارادہ ہجرت موقوف اور قومی ہمدردی کو پسند کیا۔"

۱۸۶۷ء میں سرسید نے برٹش انڈین ایسو سی ایشن کی جانب سے جس کے بانی اور سیکریٹری وہ خود تھے، ایک عرض داشت دربارۂ قیام "ورنیکلر یونیورسٹی" گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کی خدمت میں بھیجی جس میں تجویز پیش کی گئی تھی کہ اس یونیورسٹی میں مختلف

علوم اردو میں پڑھائے جائیں گے۔ ابھی یہ تجویز زیر غور ہی تھی کہ ہندوؤں نے اس کی سخت مخالفت شروع کر دی اور مطالبہ کیا کہ ہندوؤں کو دیوناگری رسم الخط میں لکھی جانے والی ہندی زبان میں تعلیم دی جائے۔ اس مخالفت نے سرسید کو یقین دلادیا کہ مسلم قوم اور ہندو قوم دونوں مل کر ہرگز نہیں رہ سکتیں۔ اس طرح دراصل دو قومی نظریہ خود ہندوؤں نے شروع کیا تھا اور سرسید نے اس دو قومی نظریے کو مسلمانوں کے لئے ایک نیک فال سمجھ کر اس پر سختی سے عمل کرنا شروع کر دیا تھا۔ یوں سمجھئے کہ دو قومی نظریہ دراصل اردو اور ہندی کے تنازعہ سے پیدا ہوا تھا جو آگے چل کر مسلمانوں کا نصب العین بن گیا۔ یا یوں سمجھ لیجئے کہ پاکستان کی مملکت صرف اردو کی مرہون منت ہے۔ جب سرسید بنارس میں تھے تو ہندوؤں کی طرف سے سرکاری دفتروں اور مدرسوں میں اردو کو خارج کرنے کی تحریک چلائی گئی جس کی وجہ سے سرسید اپنے دو قومی نظریہ پر مزید مستحکم ہو گئے۔ سرسید کہتے ہیں "یہ پہلا موقع تھا جب کہ مجھے یقین ہو گیا کہ اب ہندو مسلمانوں کو بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا اور دونوں کو ملا کر سب کے لئے ساتھ ساتھ کوشش کرنا محال ہے۔" سرسید کا بیان ہے کہ "انہیں دنوں میں جب کہ یہ چرچا بنارس میں پھیلا ایک روز مسٹر شیکسپیئر سے جو اس وقت بنارس میں کمشنر تھے، میں مسلمانوں کی تعلیم کے باب میں کچھ گفتگو کر رہا تھا اور وہ متعجب ہو کر میری گفتگو سن رہے تھے۔ آخر انہوں نے کہا کہ آج یہ پہلا موقع ہے کہ میں نے تم سے خاص مسلمانوں کی ترقی کا ذکر سنا ہے اس سے پہلے تم عام ہندوستانیوں کی بھلائی کا خیال کرتے تھے، میں نے کہا اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہوں گی۔ ابھی تو بہت کم ہے آگے آگے اس سے زیادہ مخالفت اور عناد ان لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں، بڑھتا نظر آتا ہے۔ جو زندہ رہے گا وہ دیکھے گا۔ مسٹر شیکسپیئر نے کہا اگر آپ کی پیشین گوئی صحیح ہو تو نہایت افسوس ہے، میں نے کہا مجھے بھی نہایت افسوس ہے مگر اپنی پیشین گوئی پر مجھے پورا یقین ہے۔" سرسید نے اپنے اس خیال کو علی گڑھ کی تعلیمی سروے رپورٹ میں بھی ایک جگہ ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے "تیس برس کے عرصہ سے مجھے ملک کی ترقی اور اس کے

باشندوں کی فلاح کا، خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، خیال پیدا ہوا ہے اور ہمیشہ میری یہ خواہش تھی کہ دونوں مل کر دونوں کی فلاح کی کوشش کریں مگر جب سے ہندو صاحبان کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اردو زبان اور فارسی کو جو مسلمانوں کی حکومت اور ان کی شاہنشہی ہندوستان کی باقی ماندہ نشانی ہے، مٹادیا جائے اس وقت سے مجھ کو یقین ہو گیا کہ اب ہندو مسلمان باہم متفق ہو کر ملک کی ترقی اور اس کے باشندوں کی فلاح کا کام نہیں کر سکتے۔ میں نہایت درستی اور اپنے تجربہ اور یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ہندو مسلمانوں میں جو نفاق شروع ہوا ہے اس کی ابتداء اسی سے ہوئی۔"

سرسید نے جو دو قومی نظریہ پیش کر کے مسلمانوں کی ہمدردی میں کام کرنا شروع کیا تھا وہ محض اوپری دل سے نہ تھا بلکہ ان کے دل کی گہرائیوں میں مسلم قوم کا درد بیٹھ گیا تھا اور وہ سوتے جاگتے اسی غم میں گھلے جاتے تھے کہ مسلمانوں کی حالت کو کس طرح سدھارا جائے۔ اس قلبی واردات کا اندازہ اس واقعے سے لگایا جا سکتا ہے جو بنارس میں مولوی سید مہدی علی کو پیش آیا تھا۔ مولوی سید مہدی علی ایک دفعہ بنارس میں مسلم قوم کی ایک فلاحی کمیٹی کے اجلاس میں شرکت کرنے گئے تھے وہ بیان کرتے ہیں کہ "جس تاریخ کمیٹی مذکور کے انعقاد کے لئے جلسہ قرار پایا تھا اس سے ایک روز پہلے میں بنارس میں پہنچ گیا تھا۔ رات کو سرسید نے میرا پلنگ بھی اپنے ہی کمرے میں بچھوایا تھا۔ گیارہ بارہ بجے تک مسلمانوں کی تعلیم کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ اسکے بعد میری آنکھ لگ گئی۔ دو بجے کے قریب جو آنکھ کھلی تو میں نے سرسید کو ان کے پلنگ پر نہ پایا۔ میں ان کے دیکھنے کو کمرے سے باہر نکلا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ برآمدے میں ٹہل رہے ہیں اور زار و قطار روتے جاتے ہیں۔ میں نے گھبرا کر پوچھا کہ کیا خدانخواستہ کہیں سے کوئی افسوس ناک خبر آئی ہے؟ یہ سن کر اور زیادہ رونے لگے اور کہا کہ اس سے زیادہ اور کیا مصیبت ہو سکتی ہے کہ مسلمان بگڑ گئے اور بگڑتے جاتے ہیں، اور کوئی صورت ان کی بھلائی کی نظر نہیں آتی۔" ۱۸۸۵ء میں علی گڑھ شہر میں بقر عید کے موقع پر ہندوؤں نے گائے کی قربانی کے خلاف مسلم کش فسادات کئے اور اس کے فوراً بعد محرم کے

موقع پر بھی تعزیوں کے جلوسوں پر حملے کئے اور بہت سے مسلمانوں کو ہلاک و زخمی کیا۔ کئی دن تک شہر میں خوں ریز ہنگامے ہوتے رہے۔ اس زمانے میں علی گڑھ کے کلکٹر مسٹر ایف ایل پیٹر تھے انہوں نے اپنے حسن انتظام سے بہت سے مسلمانوں کی جانیں بچائیں۔ اس زمانے میں سر سید علی گڑھ ہی میں تھے۔ ان پر ان مسلم کش فسادات کا گہرا اثر پڑا اور ان کے دل میں دو قومی نظریے کا یقین انتہائی حد تک پہنچ گیا۔ اس کے اگلے سال ہی انہوں نے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس قائم کر دی۔ ابتداء میں اس کا نام محمڈن ایجوکیشنل کانگریس تھا، ۱۸۹۰ء میں "کانگریس" کو "کانفرنس" کر دیا گیا اور "محمڈن" کو "مسلم" کر دیا گیا۔

یہاں پر اس غلط فہمی کا ازالہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سر سید کا مقصد دو قومی نظریے سے یہ ہرگز نہیں تھا کہ مسلمانوں اور ہندوؤں میں جنگ و جدل اور قتل و غارت گری شروع ہو جائے، کیونکہ اگر اس قسم کا مقابلہ شروع ہو جاتا تو مسلمان ہی نقصان میں رہتے اور اپنے سے تین گنی تعداد والی قوم کے ہاتھوں فنا ہو جاتے۔ سر سید صرف سیاسی اور تعلیمی جنگ لڑنا چاہتے تھے لیکن معاشرتی طور پر ہم آہنگی برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ اس حکمت عملی کا اظہار سرسید کی اس تقریر سے ہوتا ہے جو انہوں نے اپنے پوتے سید راس مسعود کی بسم اللہ کی رسم کے موقع پر کی تھی۔ سر سید نے حاضرین جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ "اے حضرات! گو میں نے اس وقت قوم ہی کا گیت گایا ہے مگر اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ہم کو اور قوموں سے محبت اور برادرانہ محبت نہیں ہے۔ ہماری قوم خراب حالت میں ہے اس لئے اسی کا گیت گایا جاتا ہے ورنہ ہم اور قوموں سے بھی ایسی ہی محبت رکھتے ہیں جیسی اپنے عزیزوں سے۔ اس وقت اس کے علانیہ دو ثبوت موجود ہیں۔ ایک یہ کہ سید محمد محمود اور مسٹر راس میں نہایت دوستی اور برادرانہ اور عزیزانہ محبت ہے۔ جب سید مسعود پیدا ہوا تو مسٹر راس اور ان کی میم صاحبہ نے موافق انگریزی رسم کے جو نہایت محبت پر دلالت کرتی ہے اپنا نام اس مولود مسعود کو دیا اور ہم نے نہایت خوشی سے ان کا نام اس کے نام کے ساتھ شامل کیا اور اسی سبب سے اس کا نام سید راس مسعود قرار پایا۔ دوسرا نمونہ (راجہ جے کشن داس بہادر سی ایس

آئی کی طرف نہایت جوش محبت کے ساتھ اشارہ کر کے کہا) ہمارا یہ ڈاڑھی منڈا دوست یہاں موجود ہے اور سید راس مسعود کو اپنی بغل میں بٹھائے ہوئے ہے۔ ان کو میں اپنا معزز اور محسن بھائی سمجھتا ہوں، اور سید محمود ان کو چچا کہتے ہیں اور سید راس مسعود دادا جہ۔ پس ہم اپنے دوستوں سے محبت رکھنے میں کچھ بھی فرق نہیں کرتے۔" یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہندوستان میں ہندو اور مسلمان بالکل ملی جلی بستیوں میں اور ملے جلے محلوں میں رہتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ گھر ہیں اور ساتھ ہی ساتھ دکانیں ہیں، سرسید دونوں کو بالکل الگ الگ قومیں سمجھتے تھے اور مسلمانوں کو ہوشیار کرتے رہتے تھے کہ وہ اپنے مفادات سے غافل نہ ہوں۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ساتھ ساتھ رہائش رکھنے کے باوجود دونوں دو جدا جدا قومیں ہیں۔ وہ لکھتے ہیں "ہندوستان میں خدا کے فضل سے دو قومیں اس طرح آباد ہیں کہ ایک کا گھر دوسرے سے ملا ہے، ایک کی دیوار کا سایہ دوسرے کے گھر میں پڑتا ہے، ایک آب ہوا میں دونوں شریک ہیں، ایک دریا کا پانی پیتے ہیں، مرنے جینے میں ایک دوسرے کے رنج و راحت میں شریک ہوتا ہے، ایک کو دوسرے سے بغیر ملے چارہ نہیں۔"

☆

سر سید کی مشکلات

جیسا کہ خود سر سید نے کہا تھا کہ قوم کی اصلاح کرنے والے کو سب سے پہلے خود اسکی قوم ہی "نکّو" بناتی ہے، سر سید کو بھی سب سے زیادہ مسلمانوں نے ہی ستایا اور انکی راہ میں کانٹے بچھائے۔ ہندو تو پہلے ہی سے خار کھاتے تھے کیونکہ سر سید مسلمانوں کو ہندوؤں کے مقابلے میں آگے بڑھانے کی کوشش کر رہے تھے، انگریز بھی سر سید سے بہت زیادہ خوش نہیں تھے کیونکہ وہ بھی دل میں یہی سمجھتے تھے کہ سر سید بظاہر تو انگریزوں کی تعریفیں کرتے ہیں لیکن در حقیقت وہ مسلمانوں کو انگریزوں کے رازوں سے آگاہ کر کے انہیں انگریزوں کا مقابلہ کرنے کے قابل بنانا چاہتے ہیں۔ سر سید شروع میں ہندو مسلم اتحاد کے حامی تھے کیونکہ انہوں نے ہاتھی کے صرف نمائشی دانت دیکھے تھے، لیکن جب انہیں ہاتھی کے کھانے کے دانت نظر آگئے تو پھر ہاتھی کے دکھانے کے دانت انہیں مزید دھوکا نہیں دے سکے۔ غرض یہ کہ سر سید کو ہر طرف سے مشکلات ہی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، لیکن وہ بڑی ہمت اور سمجھ بوجھ کے ساتھ تمام مخالفتوں سے نبرد آزما تھے۔ انکی صرف ایک ہی آرزو تھی کہ کوئی نہ کوئی تدبیر ایسی نکل آئے کہ مسلم قوم غرق ہونے سے بچ جائے۔ انہیں نہ دن کو چین تھا نہ رات کو آرام۔ ہر وقت اگر کوئی دھن تھی تو صرف خدمت قوم کی دھن تھی۔ در اصل وہ بالکل فنافی القوم کے درجے تک پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے ایک مدت کی تگ و دو کے بعد بڑی محنت اور جانفشانی سے اپنے گرد اپنے رفقائے کار کا ایک ایسا حلقہ پیدا کر لیا تھا جو مسلم قوم کی ترقی کے لئے ان کا ساتھ دینے لگا تھا، اور عام مسلمانوں میں بھی بہت کچھ بیداری پیدا ہو گئی تھی، مگر پھر بھی لاکھوں نادان مسلمان ایسے تھے جو سر سید کی جان کے دشمن ہو گئے تھے۔ عام مسلمان سر سید کو بد عقیدہ، دہریہ، کرسٹان، بے ایمان، دھوکہ باز، انگریزوں کا ایجنٹ، اسلام کا مخالف، اور کافر مطلق سمجھتے تھے، یہاں تک کہ ان کی مجوزہ انگریزی تعلیم کی وجہ سے بہت سے مولویوں نے سر سید کے لئے کفر کے فتوے جاری کر دیئے تھے۔ سر سید جتنی ان لوگوں

کو نصیحتیں کرتے تھے اتنی ہی وہ لوگ سرسید کی مخالفتیں کرتے تھے اور ان کے تعلیمی منصوبوں کو ملیامیٹ کرنا چاہتے تھے۔ سرسید کو سرعام گالیاں دی جاتی تھیں اور ان کے قتل کے منصوبے بنائے جاتے تھے۔ سرسید ان لوگوں کی دشنام طرازی اور دلآزاری کو بڑی خندہ پیشانی سے برداشت کرتے رہتے تھے۔ مسلم قوم کی عاقبت نااندیشی اور اپنی مشکلات کا ذکر سرسید نے اپنے رفیق کار نواب مہدی علی محسن الملک کو لکھے ہوئے اپنے ایک خط میں اس طرح کیا تھا "افسوس ہے کہ مسلمان ڈوبتے جاتے ہیں اور کوئی ان کا نکالنے والا نہیں۔ ہائے افسوس! امرت تھوکتے ہیں اور زہر نگلتے ہیں۔ ہائے افسوس!! ہاتھ پکڑنے والے کا ہاتھ جھٹک دیتے ہیں اور مگر کے منہ میں ہاتھ دیتے ہیں۔ اے بھائی مہدی! کچھ فکر کرو اور یقین جان لو کہ مسلمانوں کے ہونٹوں تک پانی آگیا ہے، اب ڈوبنے میں بہت کم فاصلہ باقی ہے۔"

سرسید مسلمانوں کے روشن مستقبل کے لئے اردو زبان کو سرکاری زبان کی حیثیت سے قائم رکھنا چاہتے تھے لیکن ہندو اس کی زبردست مخالفت کر رہے تھے اور سرسید کی تجاویز پر پانی پھیرنا چاہتے تھے۔ بعض انگریز حکام بھی ہندوؤں کا ساتھ دے رہے تھے۔ اور سرسید کے لئے مزید مشکلات پیدا کر رہے تھے۔ مثال کے طور پر مسٹر جے کیمبل لیفٹیننٹ گورنر بنگال نے ۱۸۷۱ء میں اپنی ایک یادداشت میں اردو کے خلاف اپنے تعصب کا اظہار اس طرح کیا تھا، "حقیقت یہ ہے کہ اردو زبان اہل دربار اور دلّی کی طوائفوں کی زبان ہے۔ اس کو ملک کی مروجہ زبان نہیں کہہ سکتے۔ میں نے پورا ارادہ کر لیا ہے کہ جہاں تک میرا بس چلے گا اردو زبان کی تعلیم کو جو ہمارے مدرسوں میں دی جاتی ہے روکنے کی کوشش کروں گا۔" سرسید نے اس زہر کا تریاق اس طرح تلاش کیا کہ ۹ دسمبر ۱۸۷۳ء کو الٰہ آباد میں اردو کی حمایت میں ایک جلسہ کرایا اور ہندی تحریک کو روکنے کیلئے وہاں ایک صدر کمیٹی بنائی جس کے سیکریٹری خود سرسید احمد خاں قرار پائے۔ اس طرح انہوں نے آخر دم تک اردو کے لئے جدوجہد کی۔ اردو کی حمایت میں ان کا آخری مضمون علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں ان کی وفات سے نو دن پہلے شائع ہوا تھا۔ وہ ہر قیمت پر مسلمانوں کے مستقبل کو تابناک دیکھنا چاہتے تھے، چنانچہ جملہ

مشکلات سے عہدہ برآ ہونے کے لئے اور اپنے منصوبوں کو مستقل جاری رکھنے کی غرض سے سرسید نے ۱۸۸۹ء میں ایک قانونِ ٹرسٹیان مرتب کیا تاکہ ان کی وفات کے بعد بھی تعلیمی نظام میں کوئی رخنہ نہ پڑ سکے۔

سرسید نے مسلم قوم کی نجات کا راز صرف دو باتوں میں سمجھا تھا۔ ایک تو یہ بات کہ مسلمانوں کو تہذیب یافتہ بنا کر انگریزی زبان کے ذریعے مغربی جدید علوم کی اعلیٰ تعلیم دی جائے تاکہ وہ دنیا میں ترقی کر سکیں۔ دوسری یہ بات کہ مسلمان رعایا اور انگریز حکومت کے درمیان جو منافرت کی خلیج حائل ہو گئی تھی اُسے پاٹ دیا جائے تاکہ مسلمان اپنے انگریز حاکموں کے انتقام سے محفوظ رہ کر اعلیٰ عہدے حاصل کر سکیں او. اپنی ثقافت کو قائم رکھ سکیں۔ اس کے برعکس مسلمانوں کا یہ حال تھا کہ انھیں اپنی پسماندگی اور جہالت کا احساس تک نہیں تھا بلکہ ۱۸۵۷ء میں اپنی شکست فاش کے باوجود اپنی خوش فہمی کی وجہ سے یہی یقین رکھتے تھے کہ انگریزوں کی حکومت بہت جلد ختم ہونے والی ہے اس لئے انگریزوں سے نفرت کرنا ہی سب سے زیادہ بہتر ہے۔ لیکن سرسید کو اپنی دور اندیشی کی وجہ سے یہ یقین ہو گیا تھا کہ کم سے کم سو سال تک انگریز ہندوستان پر مسلط رہیں گے۔ اس لئے سرسید نے یہی طے کیا تھا کہ انگریزوں کو انگریزوں کے ہی ہتھیار سے شکست دینی چاہئے۔ لہٰذا انھوں نے یہ طریقہ کار اختیار کیا تھا کہ انگریزوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات بڑھا کر، ان کی ترقی یافتہ زبان سیکھ کر، ان کے علوم و فنون میں مہارت پیدا کر کے، انھی کی طرح تربیت یافتہ ہو کر، ان کے شانہ بہ شانہ بڑے بڑے عہدے حاصل کر کے اور اسلام کی صداقت و عظمت کی دھاک ان پر بٹھا کر، مسلمانوں کو ترقی کی اس بلندی تک پہنچا دیا جائے کہ انجام کار وہ اپنی کھوئی ہوئی آزادی دوبارہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکیں۔

سرسید کے دل میں مسلم قوم کی بربادی کا کتنا غم تھا اور ان کے سامنے مشکلات کے کتنے پہاڑ کھڑے ہوئے تھے اس حقیقت کا اندازہ صرف ایک مثال سے لگایا جا سکتا ہے۔ سرسید نے ایک جگہ تحریر کیا تھا "۱۸۵۷ء لوگوں کو یاد ہوگا۔ میں اس زمانے میں بجنور میں تھا

اور میرا گھربار سب کچھ لٹ گیا تھا لیکن مجھے غم تھا تو اپنی قوم کی بربادی کا۔ آپ یقین کریں اس غم نے مجھے بوڑھا کر دیا اور میرے بال سفید ہو گئے۔" ادھر تو سرسید اپنی قوم کے غم میں گھلے جا رہے تھے اور ادھر کچھ نادان مولویوں کی نفرت کا یہ عالم تھا کہ سرسید کے خلاف کفر کے فتوے جاری کر رہے تھے۔ کفر کے فتووں کے حصول کی کوششوں میں کانپور کے مولوی امداد العلی پیش پیش تھے۔ جب ہندوستانی مولویوں کے فتووں سے کام نہ چلا تو مولوی علی بخش خاں سرسید کے خلاف کفر کے فتوے حاصل کرنے مکہ معظمہ تشریف لے گئے اور ایڑی چوٹی کا زور لگا کر غلط بیانی کے ذریعے کفر کے چار عدد فتوے لے کر واپس آئے، اور ہر طرف سرسید کے خلاف پروپیگنڈا کرنے لگے۔ اتفاق سے مکہ معظمہ میں قیام کے دوران مولوی علی بخش خاں کو حج اکبر کرنے کا بھی موقع مل گیا تھا۔ جب سرسید کو اس بات کا علم ہوا تو مولوی علی بخش خان کے خلاف کسی قسم کے غیظ و غضب کا اظہار کرنے کے بجائے اس عالی ظرف انسان نے اپنے خلاف اتنی بڑی سازش کو بھی ہنس کر ٹال دیا، اور کہا بھی تو صرف اتنا کہا کہ "جو صاحب ہماری تکفیر کے فتوے لینے کو مکہ معظمہ تشریف لے گئے تھے اور ہمارے کفر کی بدولت ان کو حج اکبر نصیب ہوا، ان کے لائے ہوئے فتووں کو دیکھنے کے مشتاق ہم بھی ہیں.... سبحان اللہ ہمارا کفر بھی کیا کفر ہے کہ کسی کو حاجی، کسی کو ہاجی، کسی کو کافر اور کسی کو مسلمان بناتا ہے....."

کبھی کبھی سرسید شدید مخالفتوں سے گھبرا بھی جاتے تھے مگر پھر بھی ہمت نہ ہارتے تھے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں "مجھے یقین ہے کہ میری زندگی میں عام مسلمانوں کی گالیوں اور نفرت سے مجھ کو نجات نہیں ملے گی۔ اگرچہ ایسی باتوں سے کہیں دل کو ملال آتا ہے جو مقتضائے بشریت ہے مگر فی الفور دل میں اس خیال کے آتے ہی رفع ہو جاتا ہے کہ آج تک کوئی نیکی چاہنے والا ایسا نہ ہوا جس کے مقابل کوئی مخالف کھڑا نہ ہوا ہو۔" ایک دفعہ اتنے پریشان ہوئے کہ ترک وطن کا ارادہ کر لیا لیکن پھر اپنی بے سہارا قوم کا خیال آگیا اور رک گئے۔ اس بات کا اعتراف انہوں نے خود بھی کیا ہے "فیصلہ کیا تھا کہ ملک چھوڑ کر کہیں باہر چلا جاؤں گا لیکن ضمیر نے گوارا نہیں کیا۔ 'قوم تباہ ہو اور تو باہر جائے یا گوشہ نشین ہو جائے؟، اب تو

فیصلہ کیا ہے جینا بھی اسی بدحال قوم کے ساتھ ہوگا اور مرنا بھی اسی کے ساتھ۔" انتہائی ناسازگار حالات میں بھی ان کے پائے ثبات کو لغزش نہ ہوئی، وہ آخر دم تک قوم سے چندہ کی اپیلیں کرتے رہے اور قوم کے بچوں کے لئے تعلیمی درسگاہ بنانے کے لئے پیسہ پیسہ جمع کرتے رہے۔ یہاں تک کہ تھیٹر کی اسٹیج پر آکر بھی انہیں کہنا پڑا کہ "اے صاحبو! میں نے کوئی ایسا پہلو نہیں چھوڑا جس سے قوم کے غریب بچوں کے اخراجات تعلیم میں مدد پہنچے، مگر افسوس کامیابی نہ ہوئی۔ خود لوگوں سے بھیک مانگی مگر قلیل ملی، والنٹیئر بنانے چاہے مگر کم بنے، اور جو بنے ان سے کچھ بن نہ آیا۔ پس میں اسٹیج پر اس لئے آیا ہوں کہ بچوں کی تعلیم کے لئے کچھ کر سکوں۔ دوستو، افسوس کی بات ہے تم اپنے بیٹے کی بسم اللہ میں ہزاروں روپے خرچ کر دیتے ہو اس خوشی میں کہ ہمارا بیٹا پڑھنا شروع کرنے کے لائق ہو گیا مگر اس جگہ کو بنانے اور قائم کرنے کی فکر نہیں کرتے جہاں وہ پڑھے اور تمہاری اس خوشی کو، جو قبل از وقوع تم نے اس کو فرض کر لیا ہے، پورا کرے۔" ایک دفعہ لاہور میں ایک جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے انسو بہاتے ہوئے دردناک لہجے میں قوم کو پکار کر کہا تھا "برادران و بزرگان پنجاب! مجھ ناچیز فقیر کا نام تو آپ نے سنا، مان لیجئے کہ میں ایک بد عقیدہ، کافر، گردن مروڑی ہوئی مرغی کھانے والا کرسٹان اور اس طرح نہ جانے کتنے فتوے علماءِ دین نے اس حقیر کو دے ڈالے۔ میں کہتا ہوں میں سب کچھ سہی لیکن ذرا سوچیں جب آپ اپنا مکان بناتے ہیں جس میں آرام سے رہتے ہیں' آپ کے بچے پرورش پاتے ہیں' اس کی تعمیر میں چوڑے' چمار' قلی' بد عقیدہ' بت پرست' سب مزدوری کرتے ہیں مگر نہ کبھی آپ اپنے گھر کو مسمار کرتے ہیں اور نہ ہی مسجد ڈھاتے ہیں۔ بس مجھ کو بھی اس دارالعلوم یا کالج کے قائم کرنے میں قلی چمار کی مانند تصور کر لیجئے اور اس وجہ سے کہ اس کا بنانے والا ایک چوڑا چمار اور بد عقیدہ آدمی ہے۔ للہ اپنے گھر کو مسمار نہ کیجئے۔ خدا کے واسطے اپنے بچوں کی خوش حالی' باعزت مستقبل اور ان کی خوشی کے لئے اس گھر کو مت ڈھائیے، اور اس فقیر کی جھولی بھر دیجئے' اس فقیر کی جھولی بھر دیجئے۔" ایک اور موقع پر تقریر کرتے ہوئے سرسید نے مسلم قوم کے مخالفانہ رویے کی شکایت کی اور اپنی

مشکلات کا ذکر بھی کیا۔ اس کے بعد اپنی درد بھری آواز سے اپنی قوم کے ضمیر کو اس طرح جھنجوڑا "اے دوستو! میری بات سن لو۔ میں سچ کہتا ہوں۔ سچی بات کڑوی لگتی ہے۔ میں نہایت دلسوزی سے تم کو سخت لفظوں میں سمجھاتا ہوں کہ اگر تم قوم کی بھلائی میں کوشش نہ کرو گے تو تمہاری آئندہ نسلیں اپنے اسلاف کو کوسیں گی اور خود تمہاری روحیں اپنی اولاد کو ذلت کی حالت میں دیکھ کر قبروں میں تڑپیں گی' پھر وہ عذاب ان کو دوزخ کے عذاب سے بھی زیادہ تر سخت معلوم ہوگا۔ برائے خدا سمجھو اور قوم کی بھلائی پر متوجہ ہو۔ دوستان من قوم کی بھلائی اور ترقی اسی وقت ہو سکتی ہے جبکہ زمانہ کے مناسب ان کی ترقی کے اسباب جمع کئے جائیں۔ اس زمانے میں قومی ترقی صرف زمانے کی حاجتوں کے موافق تعلیم پر منحصر ہے۔"

سرسید کی کن کن مشکلات کا ذکر کیا جائے۔ یہ ایک لمبی داستان ہے جسے یہاں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ سرسید کی مشکلات پر مولانا شبلی نعمانی نے چھوٹی عمر میں ایک نظم کہی تھی۔ اس نظم کے پانچ اشعار ذیل میں درج کئے جارہے ہیں۔

گزرا وہ ہر ایک رہ گزر پر — دی اس نے صدا ہر ایک در پر
ہر اک کو یہ ماجرا سنایا — ہر بزم میں اپنا راگ گایا
ناکام رہا صدائیں دے کر — دشنام سنیں دعائیں دے کر
برگشتہ کہا کسی نے دیں سے — لعنت کا صلہ ملا کہیں سے
کیا تلخ ملے جواب اس کو — کیا کیا نہ دیئے خطاب اس کو

☆

سرسید کا طریقۂ اظہار

سرسید کی تحریر اور تقریر دونوں ہی میں اتنا اثر ہوتا تھا کہ قارئین و سامعین مسحور ہو جاتے تھے اور سرسید کی ہر بات کو ماننے کے لئے دل و جان سے تیار ہو جاتے تھے۔ سرسید کا یہ مخصوص طریقۂ اظہار ہی ان کا اصلی ہتھیار تھا جس کے ذریعہ سے انہوں نے اپنی بھٹکی ہوئی قوم پر قابو پایا تھا۔ انہوں نے اپنی تحریروں اور اپنی تقریروں سے اپنے تعلیمی منصوبوں کے لئے لاکھوں روپیہ کا چندہ جمع کیا اور اپنے مخلص ساتھی پیدا کئے جنہوں نے مسلم قوم کے لئے مدرسۃ العلوم قائم کرنے میں سرسید کی مدد کی۔ ان کی تحریر سادہ اور پر تاثیر ہوتی تھی جو لوگوں کے دل و دماغ پر جادو کی طرح اثر کرتی تھی۔ اسی طرح ان کی تقریر کا انداز بھی ایسا ہوتا تھا کہ سننے والا ان کی آواز کو اپنے ہی دل کی آواز سمجھتا تھا۔ وہ جب چاہتے تھے مجمع کو ہنسا دیتے تھے اور جب چاہتے تھے رلا دیتے تھے۔ جب وہ انفرادی طور پر کسی شخص سے عام بات چیت کرتے تھے اس وقت بھی موقع محل کی مناسبت سے ایسا طریقہ اور لہجہ اختیار کرتے تھے کہ دوسرا شخص ان کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔ ان کی جسامت، شکل و صورت اور گھنی داڑھی کا بھی بہت رعب پڑتا تھا۔ ان کے گلے میں داہنی طرف ایک بڑی سی رسولی تھی جو ابھری ہوئی بری معلوم ہوتی تھی لیکن سرسید اس رسولی کو مفلر میں لپیٹے رہتے تھے اور یہ مفلر ان کی پھیلی ہوئی ڈاڑھی کے پیچھے چھپا رہتا تھا۔ سرسید جب بھی تقریر کرتے تھے تو وہ سامعین کی دکھتی ہوئی رگ پر ہاتھ رکھ کر بات کرتے تھے تاکہ مجمع پر فوری اثر پڑے۔ کرنل گریہم کہتے ہیں

"سرسید ایک پیدائشی اوریٹر ہیں جب وہ اپنے خاص مقصد کے لئے جوش میں بھری ہوئی تقریر کرتے ہیں تو ان کی طرز تقریر مسٹر گلیڈسٹن سے مشابہ ہوتی ہے۔ اس جوش کے ضبط کرنے کی کوشش میں ان کے ہونٹ کانپنے لگتے ہیں، آواز دردناک ہو جاتی ہے اور چہرہ متغیرہ ہو جاتا ہے۔ یہ تمام درد و غم کی علامتیں ان کے سامعین پر بجلی کی طرح اثر کرتی ہیں۔"

سرسید کی تقریر کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ ایسی ایسی عبرت ناک حقیقتوں کو

ابھار کر لوگوں کے سامنے پیش کر دیتے تھے کہ سامعین کے دل دہل جاتے تھے اور سرسید کا ایک ایک لفظ ان کے دلوں پر نقش ہو جاتا تھا۔ مثلاً اپنی ایک تقریر میں مسلمانوں کو ان کے بھیانک مستقبل کی فکر کرنے کے لئے اس طرح آگاہ کرتے ہیں "نواب خلیل اللہ خاں شاہ جہانی کا نام آپ لوگوں نے سنا ہوگا۔ ان کے پروتے کو میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا کہ لوگوں کے پاؤں دابنے آتا تھا اور دو چار پیسے لے جاتا تھا۔ تغلق آباد کے گاؤں میں جس قدر مسلمان گھسیارے آباد ہیں جو سارے دن گھاس کھود کر شام کو بیچتے ہیں میں نے خوب تحقیق کیا ہے کہ سلطان محمد عادل تغلق شاہ کی اولاد میں ہیں۔ ... دنیا میں گزرے ہوئے زمانہ کے واقعات سے ہم کو عبرت اور نصیحت پکڑنی چاہئے۔ ..... دیکھو ہوشیار ہو' یہی حال ہماری قوم کا ہونے والا ہے' کوئی آثار بھلائی اور بہتری کے ان میں نہیں دکھائی دیتے' بلکہ بر خلاف اس کے تنزل اور ادبار کی علامتیں موجود ہیں۔" اسی طرح ایک اور مقام پر سرسید اپنی ایک تحریر میں مولوی سید مہدی علی کو لکھتے ہیں "بھائی مہدی! تم پایونیرٔ اخبار الہ آباد کے ایک آرٹیکل کا ترجمہ سنو۔ وہ لکھتا ہے 'آج کل ہندوستان میں خاندان مسلمانوں کے روز بروز گھٹتے جاتے ہیں۔ چنانچہ صرف بنگالہ میں تمام سلطنت کے ملازمین میں چند مسلمان ہیں وہ بھی ضعیف ہیں جلد پنشن لیں گے اور ان کی جگہ یقینی کوئی مسلمان نہیں ہونے کا' اور آئندہ بجز چپراسی اور دفتری کے کوئی مسلمان معزز عہدہ پر نہیں ہوگا' دیکھو' جو میں کہتا تھا اب سب لوگ وہی کہتے ہیں۔"

مولانا الطاف حسین حالیؔ نے سرسید کے اصرار پر اپنا مشہور مسدس "مد و جزر اسلام" لکھا تھا جس میں مسلمان قوم کو خواب غفلت سے جھنجوڑ کر بیدار کیا گیا تھا۔ اس مسدس کو سرسید اپنی بخشش کا ذریعہ سمجھتے تھے جس کا اظہار انھوں نے ان لفظوں میں کیا" بے شک میں اس کا محرک ہوا اور اس کو میں اپنے اعمال حسنہ میں سمجھتا ہوں کہ جب خدا پوچھے گا کہ تو کیا لایا؟ میں کہوں گا حالی سے مسدس لکھوا لایا ہوں اور کچھ نہیں لایا" جب سرسید انگلستان میں تھے تو حب اسلام اور عشق رسول میں غرق ہو کر انھوں نے ارادہ کر لیا تھا کہ سیرۃ النبی پر ایک بلند پایہ کتاب تصنیف کریں گے۔ اس سلسلے میں وہ مولوی سید مہدی علی کو

لکھتے ہیں "مصمم ارادہ کرلیا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی سیر میں جیسا کہ پہلے سے ارادہ تھا کتاب لکھی جائے۔ اگر تمام روپیہ خرچ ہو جائے اور میں فقیر بھیک مانگنے کے لائق ہو جاؤں تو بلا سے، قیامت میں یہ تو کہہ کر پکارا جاؤں گا کہ اس فقیر مسکین احمد کو جو اپنے دادا محمد ﷺ کے نام پر فقیر ہو کر مر گیا، حاضر کرو۔ مارا ہمیں تمغۂ شاہنشاہی بس است" سرسید نے اپنی تقریر میں اپنے عقیدہ کا اظہار اس طرح کیا "میں نے خالی الذہن ہو کر اسلام پر بہت کچھ غور کی اور نہایت غور و فکر کے بعد میرے دل میں اس بات کا یقین ہوا کہ دنیا میں کوئی مذہب سچا ہے تو وہ اسلام ہی ہے، اور میں اس دلی یقین پر اس کی تائید کرتا ہوں، نہ اس وجہ سے کہ میں مسلمان کے گھر میں پیدا ہوا ہوں اور مسلمان ہوں" پھر اپنے ایمان پر فخر کرتے ہوئے اس طرح اظہار کیا "جیسا کہ میں خود اپنی تحقیق سے، نہ تقلید سے، دین اسلام کو حق سمجھتا ہوں اس قدر یقین آپ کے شہر کے بڑے بڑے لمبی ڈاڑھی والوں کو اور ہزار ہزار دانہ کی تسبیح والوں کو اور جو مکہ و مدینہ سے پیر و خلیفہ و مرشدی کا جبہ و دستار لے کر آتے ہیں ان کو بھی نہیں ہے" پھر فرمایا "میں تو ہدف تیر ہائے ملامت ہو گیا ہوں اور روز بروز ہوتا جاؤں گا۔ شاید بعد میرے کوئی زمانہ آوے جب لوگ میری دلسوزی کی قدر کریں"

سرسید جب بھی عام بات چیت میں انفرادی طور پر لوگوں سے ملتے تھے اور ان سے چندہ مانگتے تھے تو ان کا طریقۂ اظہار ہر ایک شخص کیلئے اس کے مزاج کے مطابق مختلف ہوتا تھا۔ مثلاً علی گڑھ شہر کے ایک ہم کفو دوست سید احمد حسین وکیل سے جب بھی چندہ مانگنا ہوتا تھا تو وہ ایک نرالا ہی طریقۂ اظہار اختیار کرتے تھے۔ چونکہ سید احمد حسین وکیل شاعر تھے اور عتیق تخلص کرتے تھے، ادھر سرسید بھی شاعر تھے اور آہی تخلص کرتے تھے، اس لئے جب بھی سرسید کو ان سے چندہ مانگنا ہوتا تھا، اور بار بار مانگنا ہوتا تھا، تو ہر بار سرسید اپنے خاص آدمی کو اپنا ایک پرچہ دے کر بھیجتے تھے جس پر ہر بار اپنا یہ شعر لکھ کر اس کے نیچے مطلوبہ رقم لکھ دیتے تھے۔

گر مکرر زلبت بوسہ گرفتم مرنج

سرخی لعل لبت بیں کہ چہ زیبا بودست

یہ پرچہ پڑھتے ہی سید احمد حسین وکیل مطلوبہ رقم بڑی عجلت اور رازداری کے ساتھ نامہ بر کو دے دیتے تھے اور سرسید کے پرچہ کو سند ثواب سمجھ کر اپنے پاس رکھ لیتے تھے۔ چونکہ سید احمد حسین وکیل نے سختی کے ساتھ منع کیا ہوا تھا کہ ان کے نام کی شہرت نہ کی جائے اس لئے حالی نے حیات جاوید میں ان کے متعلق صرف اتنا لکھا کہ "سرسید کے دوستوں میں سے ان کے ایک نہایت عزیز دوست خرچ کرنے میں کبھی اعتدال اور میانہ روی سے تجاوز نہیں کرتے تھے مگر کبھی ایسا نہیں ہوا کہ سرسید نے ان سے چندہ مانگا ہو اور انہوں نے انکار کیا ہو۔" ایک دفعہ سرسید نے اپنی دن رات کی مصروفیتوں کا اظہار بڑے عجیب انداز میں اس طرح کیا تھا "وقت کم اور کام بہت۔ نہ مجھ میں یہ قوت ہے کہ سورج کو ٹھہرا کر دن کو بڑھا دوں، نہ یہ طاقت کہ سورج کو نکلنے سے باز رکھ کر رات کو وسعت دے دوں۔ اگر ایک طرف کام پر متوجہ ہوتا ہوں تو اور بہت سے ضروری کام رہ جاتے ہیں۔"

سرسید کا ایک اجتہاد یہ بھی تھا کہ "مسلمانوں کو انگریزوں کے ہاں خود ان کے ساتھ، انہیں کے ہاتھ کا پکا ہوا، انہیں کا فتنہ جس طرح کہ انہوں نے کیا ہو، کھانا درست ہے، صرف سور اور شراب اور حرام چیزوں سے پرہیز کرنا لازم ہے۔" اس اجتہاد کے مطابق انگریزوں کی گردن مڑوڑی ہوئی مرغی کھانا بھی جائز ہو گیا جو عام مسلمانوں کے مطابق ناجائز ہے۔ اس اجتہاد پر بڑا شور مچا اور سرسید کے قریبی دوست مولوی سید مہدی علی بھی ان سے ناراض ہو گئے۔ انہیں منانے کے لئے سرسید نے ایک مخصوص طریقہ انکسار کے مطابق انہیں لکھا کہ "جو کچھ غصہ آپ کو مجھ پر درباب گردن مڑوڑی ہوئی مرغی کے ہے وہ میری گردن پر، مگر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ علمائے ترکستان (یعنی ترکی) نے بلا کسی تامل کے اس کو جائز کیا ہے۔ تمام ترک، جن کی خاک پا ہونے کی بھی ہم کو لیاقت نہیں ہے، سب بے تامل کھاتے ہیں۔۔۔۔ علاوہ اس کے جو شخص احتیاطاً اس کا مرتکب نہ ہو نہایت عمدہ بات ہے مگر اس کو مسئلہ شرعی ٹھہرانا اور اس کے مرتکبین کو آکل حرام قرار دینا نہایت مضر اور اسلام کے پاؤں پر دست خود تیشہ زدن ہے۔ اس فقرے کے معنی آپ کی سمجھ میں نہیں آنے کے۔

انشاء اللہ عنقریب خدمت عالی میں حاضر ہو کر اس کی تفسیر عرض کروں گا۔" سر سید کا وہ طریقہ اظہار بھی بڑا موثر ہے جس میں انہوں نے اپنے لڑکپن میں اپنی والدہ کی تربیت کا تذکرہ کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "جس زمانے میں میری عمر گیارہ بارہ برس کی تھی میں نے ایک نوکر کو جو بہت پرانا اور بڈھا تھا کسی بات پر تھپڑ مارا۔ اسی وقت میری والدہ کو خبر ہوئی تھوڑی دیر کے بعد گھر میں گیا تو میری والدہ نے ناراض ہو کر کہا کہ اس کو گھر سے نکال دو جہاں اس کا دل چاہے چلا جائے۔ یہ گھر میں رہنے کے لائق نہیں رہا۔ چنانچہ ایک ماما میرا ہاتھ پکڑ کر گھر سے باہر لے گئی اور باہر سڑک پر چھوڑ دیا۔ اسی وقت ایک ماما دوسرے گھر سے یعنی میری خالہ کے گھر سے جو قریب تھا، نکلی اور مجھ کو میری خالہ کے گھر میں لے گئی۔ میری خالہ نے کہا کہ دیکھو تمہاری والدہ تم سے کس قدر ناراض اور غصہ میں ہیں اور اس سبب سے جو بھی گھر میں رکھے گا اس سے بھی خفا ہوں گی۔ مگر میں تم کو چھپا رکھتی ہوں اور کوٹھے پر کے ایک مکان میں مجھ کو چھپا دیا۔ تین دن تک میں اس میں رہا۔ میری خالہ میرے سامنے نوکروں اور میری بہنوں کو کہتی تھیں کہ 'دیکھنا آپا جی (یعنی میری والدہ) کو خبر نہ ہو کہ یہاں چھپے ہوئے ہیں'، تین دن بعد میری خالہ جن کو میں آپا کہا کرتا تھا میری والدہ کے پاس قصور معاف کرانے کے واسطے لے گئیں۔ انہوں نے کہا کہ اگر اس نوکر سے قصور معاف کرالے تو میں بھی معاف کر دوں گی۔ وہ نوکر ڈیوڑھی پر بلایا گیا۔ میں نے اس کے آگے ہاتھ جوڑے جب تقصیر معاف ہوئی۔" بلاشبہ ایک اچھی ماں ہزاروں استادوں سے بہتر ہے۔ اسی طرح سر سید کا وہ طریقہ اظہار بھی لاجواب ہے جس میں انہوں نے اپنی اردو نثر پر تبصرہ کیا ہے۔ "جہاں تک ہم سے ہو سکا ہم نے اردو زبان کے علم و ادب کی ترقی میں اپنے ان ناچیز پرچوں کے ذریعے کوشش کی۔ مضمون کے ادا کا ایک سیدھا اور صاف طریقہ اختیار کیا۔ جہاں تک ہماری کج مج زبان نے یاری دی الفاظ کی درستی، بول چال کی صفائی پر کوشش کی۔ رنگین عبارت سے جو تشبیہات اور استعارات خیالی سے بھری ہوتی ہے اور جس کی شوکت صرف لفظوں ہی لفظوں میں رہتی

ہے اور دل پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا پرہیز کیا۔ تک بندی سے جو اس زمانے میں مقفیٰ عبارت کہلاتی تھی ہاتھ اٹھایا۔ جہاں تک ہوسکا سادگی عبارت پر توجہ کی۔ اس میں کوشش کی کہ جو کچھ لطف ہو وہ صرف مضمون کے ادا میں ہو۔ جو اپنے دل میں ہو وہی دوسرے کے دل میں پڑے کہ دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے۔" سرسید اپنی اردو نثر میں انگریزی کے الفاظ بھی روانی کے ساتھ استعمال کرتے تھے جس کی وجہ سے ان کے طریقۂ اظہار میں ایک قسم کی وسعت اور ندرت پیدا ہو جاتی تھی، لیکن بعض حضرات ان کی اس کھچڑی زبان پر اعتراضات کرتے تھے۔ ان لوگوں کے اعتراضات کا جواب سرسید نے اس طرح دیا تھا "بعض لوگوں کو شکایت ہے کہ جو لوگ اس زمانہ میں اردو لکھتے ہیں وہ انگریزی لفظ اپنی تحریروں میں ملاتے ہیں مگر انکو غور کرنا چاہئے کہ زندہ زبان میں ہمیشہ نئے نئے لفظ ملتے اور بنتے ہیں اور جب کوئی زبان محدود ہو جاتی ہے، وہ مردہ کہلاتی ہے۔ غیر زبان کو اپنا کر لینا اہل زبان کا کام ہے مگر ان کا ملا لینا آسان کام نہیں۔ اہل زبان غیر زبان کے الفاظ اسی عمدگی سے ملا لیتے ہیں جیسے تاج گنج کے روضہ میں سنگِ مرمر پر عقیق و یاقوت و زمرد کی پچی کاری ہے۔ بے شک وہ دوسرا پتھر ہے مگر ایسا وصل ہوا ہے کہ غور سے دیکھنے پر بھی اوپر سے جڑا ہوا نہیں معلوم ہوتا، اسی میں سے پیدا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ یہ بات اہل زبان کے سوا دوسرے سے نہیں ہوسکتی۔ اور نہ سب اہل زبان سے بلکہ صرف اسی سے جسے خدا نے ایسا ملکہ دیا ہے۔"

☆

سرسید کی فہم و فراست

سرسید کی فہم و فراست اس درجہ بڑھی ہوئی تھی کہ اسے سرسید کی روشن ضمیری سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ اپنی اسی فہم و فراست کی وجہ سے انہیں کبھی کوئی دھوکا نہ دے سکا سوائے شام بہاری لال کے جس نے سرسید کے پیٹ میں گھس کر نمک حرامی کی اور سرسید کو دھوکا دے کر ایک لاکھ روپے سے زیادہ کا غبن کرلیا۔ سرسید ہر معاملہ کی تہہ تک پہنچ کر اس کے متعلق اپنی رائے قائم کرتے تھے اور پھر اسی کے مطابق عمل کرتے تھے۔ اسی وجہ سے وہ ہر محاذ پر کامیاب رہے۔ آج بھی اگر مسلمان قوم صلح و آشتی، اتحاد و یکجہتی، اور محبت و خلوص کے ساتھ زندگی گزارنا چاہتی ہے، اور ترقی کی راہ پر گامزن ہونا چاہتی ہے تو ہر قدم پر سرسید کے نقش قدم سے رہنمائی حاصل کرنی ہوگی، خواہ ان کی فہم و فراست کی باتیں عام لوگوں کی سمجھ میں آئیں یا نہ آئیں۔ انہوں نے اپنی فہم و فراست ہی کی مدد سے ہندوستان کو مسلمانوں کے لئے دوسرا اسپین نہیں بننے دیا۔ سرسید کا مقولہ تھا کہ "دل کی جس قدر بیماریاں ہیں ان میں سب سے زیادہ مہلک خوشامد کا اچھا لگنا ہے" یہ انکا محض مقولہ ہی نہیں تھا بلکہ انہوں نے اس پر عمل کر کے بھی دکھایا۔ مثلاً ایک دفعہ کسی اجنبی شخص نے سرسید کو ایک خط لکھا جس میں سرسید کی تعریفیں کر کے ان کے ذریعے سے کچھ رقم اینٹھنی چاہی تھی، لیکن سرسید اس کی چکنی چپڑی باتوں میں نہیں آئے۔ اس شخص نے خط میں لکھا تھا کہ "میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ ایک بزرگ ہیں جن کی لوگ بے انتہا تعریف کرتے ہیں کہ ان کی تمام عمر قوم کی خیر خواہی میں گزری ہے۔ جب میری آنکھ کھلی تو مجھ کو یقین ہوگیا کہ ہوں نہ ہوں وہ بزرگ آپ ہی ہیں اور میری مشکل آپ ہی سے آسان ہوگی" سرسید نے فوراً جواب لکھا کہ "جس باب میں آپ سفارش چاہتے ہیں اس سے مجھ کو کچھ تعلق نہیں ہے اور جن بزرگ کو آپ نے خواب میں دیکھا ہے وہ غالباً شیطان تھا۔" ایک اور موقع پر کسی اجنبی مولوی نے شاید سرسید کی اصول پرستی کا امتحان لینے کے لئے انہیں لکھا کہ "میں بہت کثیر العیال ہوں اور

معاش کی طرف سے تنگ رہتا ہوں۔ آپ کسی ریاست میں یا سرکار انگریزی میں میری نوکری کے لئے سفارش کر دیجئے۔ میں نے انگریزی تعلیم تو نہیں پائی مگر عربی کی کتب درسیہ پڑھی ہیں۔ جو کام آپ میرے لائق سمجھیں اس کے واسطے سفارش کر دیں" سرسید نے ان کو لکھ بھیجا کہ "میری عادت کسی کی سفارش کرنے کی نہیں ہے، اور وجہ معاش کی تدبیر میرے نزدیک اس سے بہتر نہیں ہے کہ آپ میری تفسیر کا رد لکھ کر چھپوائیں خدا چاہے تو خوب بکے گی اور آپ کو تنگیِ معاش کی شکایت نہیں رہے گی۔" ایک دفعہ کسی اجنبی شخص نے شاید سرسید کا دل جلانے کے لئے انہیں ایک خط بھیجا جس میں اطلاع دی گئی تھی کہ "کسی مولوی نے آپ کی مصنفہ کتابوں کو اپنے ایک شاگرد سے جو رئیس اعظم ہے چھین کر آگ میں جلا دیا" سرسید نے اس کے جواب میں لکھا کہ "اس مولوی کو اس عمل سے کیا فائدہ ہوا؟ اگر وہ ہمارے مطبع سے بہت سی کتابیں خرید کر جلاتا تو مطبع کو بھی فائدہ ہوتا اور اس کا بھی دل ٹھنڈا ہوتا۔"

ایک دفعہ جب سرسید حیدر آباد میں نظام دکن کے مہمان تھے، ایک مولوی صاحب نے سرسید پر اپنا احسان چڑھانے کے لئے اطلاع دی کہ ایک مسلمان تاجر آپ کو قتل کرانا چاہتا تھا لیکن جب میں نے اس کے سامنے آپ کی صفائی پیش کی تو اس نے آپ کو قتل کرانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ سرسید نے فوراً اس مولوی کو جواب دیا کہ "افسوس ہے کہ آپ نے اس دین دار مسلمان کو اس ارادے سے روک دیا اور ہم کو ہمارے بزرگوں کی میراث سے جو ہمیشہ اپنے بھائی مسلمانوں ہی کے ہاتھ سے قتل ہوتے رہے ہیں محروم رکھا۔" ایک شخص نے سرسید کو خط لکھ کر یہ پوچھا کہ "اگر نماز میں قرآن شریف کا ترجمہ پڑھ لیا جائے تو آپ کے نزدیک کچھ قباحت تو نہیں؟" سرسید نے اس کے جواب میں یہ لکھا کہ "مخدومی! نماز میں قرآن مجید بلفظہ نہ پڑھنے اور اس کا ترجمہ پڑھ لینے میں بجز اس کے اور کوئی قباحت نہیں کہ نماز نہیں ہوتی۔" ایک دفعہ سہارن پور کی جامع مسجد کی تعمیر کے لئے جب سرسید سے چندہ مانگا گیا تو انہوں نے چندہ دینے سے انکار کر دیا کیونکہ وہ خود مدرسۃ العلوم کیلئے چندہ جمع کر رہے تھے۔ جب ان سے اس انکار کا سبب دریافت کیا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ "میں خدا کے

زندہ گھروں کی تعمیر کی فکر میں ہوں اور آپ لوگوں کو اینٹ مٹی کے گھر کی تعمیر کا خیال ہے۔"

سرسید کو اگر یہ بات معلوم ہو جاتی تھی کہ کوئی شخص بحث برائے بحث کرنا چاہتا ہے تو وہ پہلے ہی سے ایسا رویہ اختیار کرتے تھے کہ اصل بحث شروع ہی نہ ہونے پاتی تھی۔ ایک دفعہ ریل کے سفر میں کسی پادری نے سرسید سے خدا پر بحث کرنی چاہی۔ سرسید نے فوراً جواب دیا "میری تو ان سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی اس لئے میں ان کو نہیں جانتا" پادری نے متعجب ہو کر کہا "ہیں! آپ خدا کو نہیں جانتے؟" سرسید نے کہا "مجھی پر کیا موقوف ہے، جس سے ملاقات نہ ہو اس کو کوئی بھی نہیں جانتا۔" پھر کسی شخص کا نام لے کر پوچھا "آپ اس کو جانتے ہیں؟" پادری نے کہا "نہیں، میں اس سے کبھی نہیں ملا" سرسید نے کہا "پھر جس سے میں کبھی نہ ملا ہوں نہ میں نے کبھی اس کو اپنے ہاں کھانے پر بلایا ہو نہ مجھ کو اس کے ہاں کھانے پر جانے کا اتفاق ہوا ہو، اس کو میں کیوں کر جان سکتا ہوں؟" پادری یہ سن کر خاموش ہو رہا اور اپنے ساتھی دوسرے انگریز سے انگریزی میں کہا کہ "یہ تو سخت کافر ہے" سرسید کی اسی قسم کی باتیں جب دوسرے ناواقف لوگ سنتے تھے تو وہ بھی سرسید کو کافر ہی سمجھتے تھے حالانکہ سرسید کی یہ ایک حکمت عملی ہوتی تھی جس کے ذریعے سے وہ بہت سی بے کار کی بحثوں سے بچ جاتے تھے۔ اسی طرح ایک اور موقع پر بنارس میں ایک شیعہ صاحب سرسید کے پاس آئے اور ان سے سوال کیا کہ "کیوں جناب! اس اختلاف کے وقت جبکہ کچھ لوگ خلیفہ اول کا ہونا چاہتے تھے اور کچھ جناب امیر کا، اگر آپ اس وقت ہوتے تو کس کے لئے کوشش کرتے؟" سرسید نے فوراً جواب دیا "حضرت! مجھے کیا غرض تھی کہ کسی کے لئے کوشش کرتا؟ مجھ سے تو جہاں تک ہو سکتا اپنی ہی خلافت کا ڈول ڈالتا اور سو بسوے کامیاب ہوتا۔" یہ سن کر وہ صاحب بڑے مایوس ہوئے اور خاموشی کے ساتھ وہاں سے اٹھ کر چلے گئے۔ اس طرح وہ طولانی بحث شروع نہ ہو سکی۔ جس سے سرسید کا نہ جانے کتنا قیمتی وقت ضائع ہوتا اور حاصل کچھ نہ ہوتا۔

تہذیب الاخلاق کے ایک مضمون میں سرسید نے دو سنی مولویوں کے قابل اعتراض جواب پر اپنا بصیرت افروز تبصرہ اس طرح کیا تھا "جناب مولوی محمد قاسم صاحب اور جناب مولوی محمد یعقوب صاحب نے جو متعصبانہ جواب دیا اس سے ہر شخص جس کو خدا نے عقل اور محبت اور حب ایمانی دی ہو گی نفرت کرتا ہو گا۔ شیعہ مذہب کی تعلیم کا سلسلہ بالکل علیحدہ ہے جس سے اہل سنت وجماعت کو کچھ تعلق نہیں۔ پس یہ کہنا کیسا بے جا تعصب ہے کہ 'ہر گاہ اس مدرسہ میں شیعہ بھی ہوں گے اس لئے ہم شریک نہیں ہوتے۔' خدا کرے کہ وہ خیال فرما کر کہ ہندوستان میں شیعہ بھی رہتے ہیں مکہ معظمہ کو سدھاریں۔ مگر افسوس ہے کہ میں سنتا ہوں کہ حج اور طواف میں بھی شیعہ ہوتے ہیں... پس اے بزرگو! اس بات میں کیوں تعصب کو کام فرماتے ہو جس میں سب کا فائدہ مشترک ہے۔" سرسید کی فہم وفراست قرآن وحدیث کو سمجھنے میں بھی انکی مدد کرتی تھی۔ ان کا قول تھا کہ "جس حدیث کا مضمون آنحضرت ﷺ کی جلالتِ شان کے منافی ہو میرے نزدیک وہ یقینی موضوع ومفتری ہے اگرچہ تمام محدثین کا اس کی صحت پر اتفاق ہو۔" سرسید کا ایک قول یہ بھی تھا کہ "دین چھوڑنے سے دنیا نہیں جاتی مگر دنیا چھوڑنے سے دین بھی ہاتھ سے چلا جاتا ہے"

سرسید کے مخالفین ان کے مذہبی عقائد پر بھی عجیب عجیب قسم کے اعتراض کرتے تھے حالانکہ وہ خدا اور رسول پر پکا عقیدہ رکھتے تھے البتہ شرک آمیز رسم ورواج کے قائل نہیں تھے۔ یہ ضرور ہے کہ ان کے بعض مذہبی خیالات قابل قبول نہیں تھے لیکن ان سے قطع نظر سرسید کا اصل مقصد مسلمانوں کو اعلیٰ تعلیم اور اسلامی تربیت کی طرف مائل کرنا تھا۔ بعض دفعہ ان پر ایسی تہمتیں بھی لگائی جاتی تھیں جن کا کوئی وجود ہی نہیں تھا لیکن سرسید اپنی فہم وفراست کی بنا پر ان تہمتوں کا بھی ایسا جواب دیتے تھے کہ مخالفین دم بخود رہ جاتے تھے۔ علی گڑھ شہر میں ۱۹۳۵ء تک بھی جب کہ راقم الحروف نے وہاں ہوش سنبھالا تھا سرسید کی ایک تہمت کا تذکرہ وہاں کے کچھ بزرگوں کی زبان پر تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ "سرسید نے اپنی زندگی میں کالج کے چندہ کے لئے اپنا سر انگریزوں کو دس ہزار روپے میں بیچ دیا تھا تاکہ ان کے مرنے

کے بعد اس سر کو کاٹ کر لندن لے جاکر اس کا ڈیکشن کر کے اس پر تحقیقات کی جائے کہ آخر سرسید کی انتہائی ذہانت کا راز کیا تھا، لیکن سرسید کی وفات پر ان کی بیٹے سید محمود نے کہا تھا کہ قانونی طور پر اب میں اس میت کا وارث ہوں اس لئے ان کا سر نہیں کاٹنے دوں گا لہذا ان کا سر نہیں کاٹا گیا۔" یہ تہمت سرسید کی زندگی ہی میں ہر طرف مشہور ہو چکی تھی۔ ایک بار یہی سر بیچنے کا تذکرہ سرسید کے سامنے ہوا تو سرسید نے انتہائی متانت کے ساتھ فرمایا کہ "جو چیز خاک میں مل کر خاک ہو جانے والی ہے اس کے لئے اس سے زیادہ اور کیا عزت ہو سکتی ہے کہ دانشمند لوگ اس کو روپیہ دے کر خریدیں، اس کے ڈیکشن سے کوئی علمی نتیجہ نکالیں، اور اس کی قیمت کا روپیہ قوم کی تعلیم میں کام آوے۔ دس ہزار چھوڑ، دس روپیہ بھی اگر اس کی قیمت میں ملیں تو میرے نزدیک مفت ہیں۔"

سرسید نے اپنی روشن ضمیری اور فہم و فراست سے مستقبل میں رونما ہونے والے خطرات کا خوب اندازہ لگا لیا تھا اور اپنی قوم کی اصلی خوبیوں اور خرابیوں اور انکے علاج کا راز بھی معلوم کر لیا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ "مجھ کو اس بات کا رنج ہے کہ میں اپنی قوم میں ہزاروں نیکیاں دیکھتا ہوں پر ناشائستہ، ان میں نہایت دلیری اور جرأت پاتا ہوں پر خوفناک، ان میں نہایت استقلال دیکھتا ہوں پر بے ڈھنگا، ان کو نہایت دانا اور عقلمند پاتا ہوں پر اکثر مکر و فریب و زور سے ملے ہوئے، ان میں صبر و قناعت بھی اعلیٰ درجے کی ہے مگر غیر مفید اور بے موقع۔ پس میرا دل جلتا ہے اور میں خیال کرتا ہوں کہ اگر یہی ان کی عمدہ صفتیں عمدہ تعلیم و تربیت سے آراستہ ہو جاویں تو دین اور دنیا دونوں کے لئے کیسی کچھ مفید ہوں۔" علی گڑھ میں مدرسۃ العلوم قائم کرنے کے بعد سرسید نے جو تقریر کی اس میں کہا کہ "جہاں تک ہو سکا ہر موقع پر میں نے قومی ترقی کی تدبیروں پر غور کیا۔ سب سے اول یہی تدبیر سوجھی کہ قوم کے لئے قوم ہی کے ہاتھ سے ایک مدرسۃ العلوم قائم کیا جائے۔ جس کی بناء آپ کے شہر میں آپ کے زیر سایہ پڑی ہے..... آج جو ہم بیج بو رہے ہیں وہ ایک تناور درخت ہو جاوے گا۔ ہمارے ملک کے بڑ کے درخت کی طرح اس کی شاخیں زمین میں جڑ پکڑ لیں گی۔ اور پھر ان سے نئ اور

مضبوط شاخیں پیدا ہوں گی۔ یہ کالج ایک یونیورسٹی کی شکل میں پروان چڑھے گا جس کے طالب علم ملک کے طول و عرض میں پھیل جائیں گے اور آزادانہ تحقیق، وسیع القلبی، رواداری، اور سچے اخلاق کی تعلیمات پھیلائیں گے۔" سرسید کی فہم و فراست نے انہیں یہ بھی اچھی طرح بتادیا تھا کہ مسلم قوم کی عورتوں کو بھی تعلیم کی سخت ضرورت ہے۔ اسی لئے انہوں نے کہا تھا کہ "کوئی شبہ نہیں کہ قومی تہذیب و شائستگی کے لئے عورتوں کا تعلیم یافتہ ہونا ضروری ہے پس ہم کو لڑکیوں کی تعلیم کے لئے اور ان کو دستکاری سکھلانے کے لئے کوئی بندوبست کرنا چاہئے۔" مستورات کے پردہ کے متعلق انہوں نے فرمایا کہ "اس میں میرا کچھ اجتہاد نہیں ہے۔ منہ میں نے کبھی اس پر غور کیا۔ مگر فقہائے اسلام کا یہ مسئلہ ہے کہ منہ اور ہاتھ پہنچے تک اور پاؤں ٹخنے تک ستر میں داخل نہیں ہیں۔ فقہائے متاخرین نے بسبب فسادات زمانہ کے منہ کو بھی پردہ میں داخل کیا ہے۔" سرسید نے اپنی ایک تقریر میں اپنی علی گڑھ تحریک کا اصل مقصد نہایت مختصر الفاظ میں یوں بیان کردیا تھا کہ "ہم درحقیقت اس وقت کامیاب سمجھے جائیں گے جب فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا، نیچرل سائنس بائیں ہاتھ میں، اور کلمۂ طیبہ کا تاج سر پر جگمگا رہا ہوگا۔"

آخر میں سرسید کا ایک شعر درج کیا جاتا ہے جس میں سرسید کی فہم و فراست کا لب لباب سمایا ہوا ہے۔

زانگونہ بزی کہ چوں بمیری گویند کہ شمع بود گل شد

یعنی اپنی زندگی اس طرح گزارو کہ جب تمہیں موت آئے تو لوگ کہیں کہ "ایک شمع جل رہی تھی وہ گل ہوگئی۔"

☆

سرسید کا ڈسپلن

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ سرسید اپنے علی گڑھ کالج کے بچوں کے لئے باپ کی طرح شفیق تھے اور ان کی ہر آسائش کا پورا خیال رکھتے تھے۔ کوئی لڑکا کتنا ہی غریب کیوں نہ ہو جب وہ ایک دفعہ علی گڑھ آجاتا تھا تو اسے تعلیم مکمل کئے بغیر واپس نہیں جانے دیا جاتا تھا۔ اس کی فیس، اس کی کتابوں اور اس کی رہائش کا انتظام سرسید خود کسی نہ کسی طرح کرا دیا کرتے تھے۔ علی گڑھ کے طلبہ بھی سرسید سے اتنی ہی محبت کرتے تھے جتنی سرسید طلبہ سے کرتے تھے۔ اس پیار محبت کے باوجود سرسید طلبہ کے ڈسپلن پر بڑی سختی سے زور دیتے تھے۔ اگر انہیں اطلاع ملتی تھی کہ کسی لڑکے نے کوئی بیہودہ حرکت کی ہے تو پھر وہ اس لڑکے کو جب تک قرار واقعی سزا نہیں دے دیتے تھے اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھتے تھے۔ وہ اردو کے اس محاورہ پر کاربند تھے کہ "کھلاؤ سونے کا نوالہ، دیکھو شیر کی نظر"۔ ان کا یہ اصول تھا کہ جب تک مکمل نظم و ضبط قائم نہیں ہوگا اس وقت تک نہ تعلیم صحیح طور پر دی جا سکتی ہے اور نہ تربیت صحیح طور پر ہو سکتی ہے۔ سرسید کے ڈسپلن کی بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں لیکن یہاں پر صرف ایک ہی مثال کافی ہوگی جس کا تذکرہ ذرا تفصیل کے ساتھ کرنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے جس سے یہ معلوم ہوگا کہ سرسید ڈسپلن کو سب سے اونچا مقام دیتے تھے۔ اس واقعہ کا ذکر علی گڑھ گزٹ مورخہ یکم دسمبر ۱۹۳۵ء میں بھی شائع ہو چکا ہے اور میر ولایت حسین صاحب نے بھی اپنی اس کتاب میں اس کا ذکر کیا ہے جس کا نام ہے "میرے پچاس سال علی گڑھ میں"

۱۴ فروری ۱۸۸۷ء کو پیر کے دن علی گڑھ کالج میں سب سے پہلا اسٹرائک ہوا جس میں بورڈنگ ہاؤس کے تقریباً ستر فیصد بورڈر آناً فاناً اپنا سامان لے کر کالج کے احاطے سے باہر آگئے اور شور مچانا شروع کر دیا کہ ہم ایسے کالج میں نہیں رہنا چاہتے جہاں ہماری عزت اور ہماری رہائش محفوظ نہ ہو۔ اس اسٹرائک نے پورے کالج کو ہلا کر رکھ دیا تھا اور اگر سرسید

سختی کے ساتھ اپنے ڈسپلن پر قائم نہ رہتے تو کالج کا مستقبل خطرے میں پڑ جاتا۔ اس شورش کی وجہ یہ تھی کہ سیکنڈ ایئر کلاس کا ایک طالب علم جو ریاست بھرت پور کے قصبہ پھر سر کا رہنے والا تھا اور جس کا نام سید حسین عرف بانگڑو تھا، وہ چھٹی کے دن اکثر بورڈنگ ہاؤس سے شہر جاتا تھا اور خوب دیر تک سیر سپاٹا کر کے بہت دیر بعد واپس آتا تھا اور بارک کے بیرے کو حکم دیتا تھا کہ میرا کھانا ڈائننگ ہال سے میرے کمرہ میں پہنچا دینا۔ ۱۳ فروری ۱۸۸۷ء اتوار کو وہ حسب معمول شہر گیا اور بارک کے بیرے کو حکم دے گیا کہ دوپہر کو میرا کھانا میرے کمرے میں پہنچا دینا۔ بیرے نے سید حسین کا کھانا اس کے کمرہ میں کچھ ایسی بے احتیاطی سے رکھا کہ وہ کھانا بلی کھا گئی اور جب سید حسین بھوکا پیاسا دوپہر کو اپنے کمرہ پر پہنچا تو اس نے اپنے صندوق پر صرف ہڈیاں اور روٹی کے ٹکڑے بکھرے ہوئے پائے۔ ایسی حالت میں اسے سخت غصہ آیا اور اس نے بیرے کی پٹائی کر دی حالانکہ سرسید کا یہ حکم تھا کہ جو کوئی لڑکا بیرے کو مارے گا اسے بورڈنگ ہاؤس سے خارج کر دیا جائے گا۔ بیرا روتا ہوا سید حامد سرسید کی کوٹھی پر پہنچا اور سید حسین کی شکایت کی۔ سرسید نے فوراً انجیز صاحب کے پاس تحریری حکم بھیجا کہ سید حسین کو بورڈنگ ہاؤس سے خارج کر دیا جائے۔ دوسرے دن ۱۴ فروری ۱۸۸۷ء پیر کے دن جب کالج کھلا تو ہر طرف یہ خبر پھیل گئی کہ سید حسین کو کالج سے نکالا جا رہا ہے۔ سہ پہر کو عزیز مرزا کے کمرے میں بہت سے بورڈر جمع ہو گئے اور آپس میں مشورہ کیا کہ آج تو سید حسین کو نکالا گیا ہے، کل کو ہماری اور تمہاری باری بھی آجائے گی۔ چنانچہ چالیس بورڈروں کا ایک وفد سرسید کے روبرو پیش ہوا اور ان سے درخواست کی کہ سید حسین کے نکالے جانے کا حکم واپس لیا جائے۔ اس وفد کے سرغنہ چار سینئر لڑکے تھے جن کے نام یہ ہیں۔ عزیز مرزا، شوکت علی، امام علی، اور عبدالحمید۔ سرسید نے سختی سے کہا کہ میں اپنے حکم کو ہرگز منسوخ نہیں کروں گا بلکہ اگر تم لوگ بھی ایسی حرکت کرو گے تو تم کو بھی خارج کر دیا جائے گا۔ یہ سن کر سب لڑکے ناراض ہو کر واپس آگئے اور انہوں نے پورے بورڈنگ ہاؤس میں ایک کہرام مچا دیا۔ سارے بورڈر اسٹرائک کر کے ایک جگہ جمع ہو گئے اور بارہ برس کی عمر سے زیادہ کے جتنے

لڑکے تھے سب اپنا اپنا اسباب لے کر ظہور گیٹ کے سامنے جمع ہو گئے اور شہر میں منتقل ہونے کے لئے وسیلہ تلاش کرنے لگے۔ سید حسین نے اپنے ایک رشتہ دار سید احمد حسین وکیل سے رابطہ کیا کہ وہ اپنی خالی حویلیوں میں سے ایک حویلی سارے باغی طالب علموں کی رہائش کے لئے دے دیں لیکن انہوں نے سختی سے انکار کر دیا کیونکہ وہ خود بھی ڈسپلن کے حامی تھے اور سرسید کے بھی مخلص دوست تھے۔ البتہ قصبہ جلالی کے میر صاحب نے اپنی حویلی میں ان باغی طلبہ کو جگہ دے دی اور ان کے کھانے پینے کا انتظام بھی کر دیا۔ عبداللہ تھیٹریکل کمپنی کے منیجر نے سب طلبہ کو فری پاس دیدیئے کہ جب جی چاہے وہ مفت تھیٹر دیکھیں۔ شہر کے بعض مسلمان سرسید کے مخالف تھے اس لئے انہوں نے ان باغی طلبہ کی خوب آؤبھگت کرنی شروع کر دی۔ جب کافی دن اسی طرح گزر گئے اور کالج کے ماحول پر اس کا بہت برا اثر پڑنے لگا تو کالج کے کچھ لوگوں نے سرسید کو سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ سید حسین کو معاف کر دیں ورنہ اتنے سارے طلبہ سے ہاتھ دھونا پڑے گا لیکن سرسید ڈسپلن کے معاملہ میں اتنے سخت تھے کہ انہوں نے کسی کی ایک نہ سنی اور کہا کہ ایسے بگڑے ہوئے طلبہ کے نکل جانے سے کالج کا کوئی نقصان نہیں ہوگا بلکہ کالج کا ماحول زیادہ صاف ستھرا ہو جائے گا اور مستقبل میں اس کے بہت اچھے اثرات ہوں گے۔ جب بھی کوئی شخص ان باغی طلبہ کی سفارش کرتا تھا تو سرسید اپنا یہ فارسی کا شعر اس کو سنا دیتے تھے ۔

زکوٰۃ مال بدر کن کہ فضلہ رز را
چو باغباں بدر و بیشتر دہد انگور

(یعنی اپنے مال کی زکوٰۃ نکالتے رہو کیونکہ انگور کی بیل سے باغباں جتنے زیادہ سڑے گلے انگوروں کو نکال کر باہر پھینکتا ہے اتنے ہی انگور زیادہ پیدا ہوتے ہیں)

ایک دن میر ولایت حسین نے بیچ میں پڑ کر صلح صفائی کرانی چاہی لیکن ناکام رہے۔ پھر باغی طلبہ نے تار بھیج کر مولوی سمیع اللہ خاں کو بلوایا لیکن وہ بھی ناکام واپس گئے۔

تقریباً ایک ہفتہ تک یہ ہنگامہ آرائی جاری رہی لیکن سرسید نے کسی قیمت پر بھی سید حسین کو معاف نہیں کیا۔ جب باغی طلبہ نے دیکھا کہ سرسید ٹس سے مس نہیں ہوتے

اور سمیع اللہ خان کا سہارا بھی ٹوٹ گیا تو ان کی ہمتیں پست ہونے لگیں۔ اسی اثناء میں کالج کے پرنسپل تھیوڈور بیک نے اپنی حکمت عملی سے باغی طلبہ کے دو ساتھیوں کو توڑ لیا جس سے باغی طلبہ میں کھلبلی مچ گئی۔ پھر دوسرے دن مسٹر بیک صاحب اپنی ٹم ٹم میں سوار ہو کر شہر میں باغی طلبہ کے پاس پہنچ گئے اور وہاں ایسی اثر انگیز تقریر کی کہ تمام طلبہ نے اپنا اسٹرائک ختم کر دیا اور سب لوگ بورڈنگ ہاؤس واپس آگئے لیکن سید حسین کو واپس نہیں لایا گیا۔ اسی دن شام کو سرسید بورڈنگ ہاؤس میں تشریف لائے اور سب بورڈروں کو جمع کر کے مختصر سی تقریر کی اور فرمایا۔ "سگے در چاہ افتد کند منجلاب" (یعنی اگر کوئی کتا کنوئیں میں گر جائے تو اس کی وجہ سے پورے کنوئیں کی صفائی ہو جاتی ہے۔) اس کے بعد سرسید نے حکم دیا کہ "عزیز مرزا، شوکت علی، امام علی اور عبدالحمید کو بھی بورڈنگ ہاؤس سے خارج کیا جاتا ہے۔ یہ چاروں کالج کے احاطے سے باہر نکل جائیں۔" جب یہ چاروں خاموشی کے ساتھ باہر نکل گئے تو باقی طلبہ کو اس طرح معافی دی گئی کہ ہر ایک لڑکا باری باری سرسید کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہوتا تھا اور ان کے گھٹنوں کو ہاتھ لگا کر ان سے دعائے خیر و سلامتی کا طالب ہوتا تھا، اور پھر سرسید سے اجازت لے کر اپنے کمرہ کو چلا جاتا تھا۔ سرسید کے ڈسپلن کی اس سختی سے چند مہینے تک تو نئے بورڈروں کی آمد بند رہی، لیکن بعد میں یکایک بورڈروں کی تعداد بہت بڑھنے لگی اور بورڈنگ ہاؤس کا ڈسپلن ہمیشہ کے لئے مثالی ہو گیا۔ اس طرح سرسید نے واضح کر دیا کہ تعلیمی اداروں میں ڈسپلن کو ہر قیمت پر برقرار رکھنا لازمی ہے۔

☆

maablib.org

سرسید کی آغاز کردہ عمارات

علی گڑھ کالج کے لئے جن عمارات کی تعمیر کا آغاز خود سرسید نے اپنی انتہائی کوششوں سے اپنی ذاتی نگرانی میں کیا تھا وہ بہت اہم عمارات ہیں۔ ان میں سے کچھ عمارات کا تذکرہ بہت ضروری معلوم ہوتا ہے۔ سرسید کی آغاز کردہ عمارات میں سے کچھ تو ان کی زندگی ہی میں مکمل ہو گئی تھیں اور کچھ ان کی وفات کے بعد مکمل ہوئیں۔ ۱۸۹۵ء میں جب ہیڈ کلرک شام بہاری لال نے کالج کا ایک لاکھ سے زیادہ روپیہ غبن کر لیا تو ان عمارتوں کی تعمیر کی رفتار میں رخنہ پڑ گیا۔ بہر حال ان عمارتوں کے لئے سرسید نے کالج فنڈ قائم کیا اور اس کے لئے ہر طرف سے چندہ مانگنا شروع کیا۔ عام مسلمان اس زمانہ کے مولویوں کے کفر کے فتووں سے اس قدر خوف زدہ تھے کہ سرسید کو چندہ نہیں دیتے تھے۔ لوگوں کے اس رویے کے تدارک کے لئے بھی بڑے بڑے جتن کئے گئے۔ سرسید نے سرمایہ جمع کرنے کے جو عجیب و غریب ڈھنگ اپنائے انکا تذکرہ بہت طویل ہے لیکن یہاں پر صرف چند طریقوں کا اشارۃً تذکرہ کیا جا رہا ہے۔ سرسید نے چندہ کی ترغیب دینے کے لئے بعض لوگوں سے کہا کہ ان کے نام کے کتبے عمارتوں کی دیواروں پر لگا دیئے جائیں گے۔ بعض لوگوں سے کہا کہ ان کے ناموں سے مختلف عمارتوں اور دروازوں کو موسوم کر دیا جائے گا۔ ایک دفعہ تیس ہزار روپے کی لاٹری ڈالی جس میں انعامات تقسیم کرنے کے بعد تقریباً بیس ہزار روپیہ کالج کے لئے بچ گیا۔ کسی نے لاٹری پر شرعی اعتراض کیا تو کہا کہ ”جہاں ہم اپنی ذات کے لئے ہزاروں ناجائز کام کرتے ہیں وہاں قوم کی بھلائی کے لئے بھی ایک ناجائز کام سہی۔“ جب ان پر اعتراض کیا گیا کہ آپ طوائفوں سے گندہ پیسہ کیوں لیتے ہیں تو جواب دیا کہ اس پیسہ سے میں کالج میں بیت الخلاء بنواؤں گا۔ غرض یہ کہ چندہ جمع کرنے کے معاملات میں انہوں نے کبھی اپنی انا کا خیال نہیں کیا۔ علی گڑھ کی نمائش میں انہوں نے کتابوں کی دکان لگائی اور خود کتابیں بیچنے کیلئے دکان پر بیٹھے۔ نیشنل والنٹر بن کر گلے میں جھولی ڈالی، پینی ریڈنگ کا جلسہ کیا

اور اسٹیج پر کھڑے ہو کر غزلیں گائیں۔ دور دراز شہروں کے سفر کئے۔ دوستوں کے پیچھے پڑے رہے۔ جو لوگ ان کی دعوت کرنا چاہتے تھے سرسید ان سے دعوت کے بدلے نقد روپیہ کالج کے لئے وصول کرتے تھے۔ اپنے بیٹے سید محمود کی شادی میں جو کچھ نذرانہ علاوہ کالج کو دے دیا اور دعوت ولیمہ موقوف کر کے اس کا پانچ سو روپیہ بھی کالج کو دے دیا۔ اسی طرح اپنے پوتے سید راس مسعود کی بسم اللہ کی تقریب میں ملنے والا پانچ سو روپیہ بھی کالج کو دے دیا۔ اپنے قریبی عزیز دوست سید احمد حسین وکیل کے بازو پر بندھا ہوا امام ضامن کا روپیہ بھی ان سے مانگ کر کالج فنڈ میں جمع کر دیا اور یہ ایک روپیہ سب سے پہلا سرمایہ تھا جس سے کالج فنڈ کی ابتداء ہوئی تھی۔

کالج کی عمارتوں کی تعمیر کے لئے یو پی کے لیفٹیننٹ گورنر سر جان اسٹریچی کی کوششوں سے اور سرسید کی درخواست پر حکومت نے چوہتر ایکڑ کا وہ علاقہ الاٹ کر دیا تھا جس میں اس وقت فوجی پریڈ ہوا کرتی تھی۔ اس زمین کا قبضہ ۱۶ اپریل ۱۸۷۴ء کو مل گیا تھا اور ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو علی گڑھ چھاؤنی کے میس ہاؤس میں مدرسۃ العلوم کی رسم افتتاح ادا کی گئی۔ اس کے بعد اس زمین پر سرسید نے علی گڑھ کالج کی عمارتوں کی تعمیر میں جو غیر معمولی دلچسپی لی وہ بھی ایک معجزہ تھا۔ برسوں بلاناغہ تمام تمام دن چلچلاتی دھوپ میں اور سخت سے سخت موسم میں وہ خود موقع پر جا کر بیٹھتے تھے اور اپنی خاص نگرانی میں راج مزدوروں اور سنگ تراشوں سے کام لیتے تھے۔ باغ کی تیاری کراتے، کنوئیں کھدواتے، زمین ہموار کراتے، ہل چلواتے، روشیں بنواتے، دور دور سے ہر قسم کے پودے منگواتے اور خود ان کو اپنے سامنے لگواتے تھے۔ باوجود ان تمام باتوں کے عمارتوں کی تعمیر وغیرہ کے متعلق ہر ایک کام ان کو اپنی رائے سے کرنا پڑتا تھا۔ نہ کوئی انجینئر تھا، نہ کوئی اوورسیئر تھا، اور نہ کوئی لائق مستری تھا جس کی تجویز اور رائے پر اطمینان ہو۔ جن دیہاتی معماروں سے یہ کام لئے گئے انہوں نے کبھی اس قسم کی عالیشان عمارتیں نہیں بنائی تھیں، اس لئے سرسید کو ہر ایک عمارت کا نقشہ خود ہی سوچنا ہوتا تھا اور خود ہی اس کے تمام نشیب و فراز پر غور کرنا پڑتا تھا۔ چند عمارتوں کا ذکر ذیل

میں کیا جاتا ہے۔

(۱) وکٹوریہ گیٹ:۔ یہ عمارت ۱۸۹۴ء میں مکمل ہوئی تھی۔ وکٹوریہ گیٹ دراصل سرسید ہال کا صدر دروازہ ہے۔ اس گیٹ کے اوپر ایک بہت بڑا کلاک لگا ہوا ہے جس کا رخ شمالاً جنوباً ہے۔ اس کلاک کو مدرستہ العلوم کے ہردلعزیز پرنسپل مسٹر تھیوڈور بیک کے والد نے لندن سے تحفۃً بھیجا تھا۔ اس کا وزن ۳۳۶ پونڈ ہے۔

(۲) اسٹریچی ہال:۔ جب ہم باہر سے وکٹوریہ گیٹ میں داخل ہوتے ہیں تو اندر داخل ہوتے ہی سامنے اسٹریچی ہال نظر آتا ہے۔ سرسید ہال کی عمارتوں میں اسٹریچی ہال سب سے بڑی عمارت ہے۔ اس کا سنگ بنیاد ۱۱ دسمبر ۱۸۸۰ء کو سرجان اسٹریچی کے نام پر رکھا گیا تھا، اور ۱۲ نومبر ۱۸۹۴ء کو سرچارلس کراسٹھویٹ گورنر یوپی نے اس کا افتتاح کیا تھا۔ سرسید نے جو اشتہار نکالا تھا اس کے مطابق اسٹریچی ہال کی تعمیر میں ایک سو بیس لوگوں نے پانچ پانچ سو روپے دیئے جن کے ناموں کے کتبے سنگ مرمر پر اس عمارت کی اندر کی دیوار پر لگا دیئے گئے۔ ایک مرد خدا نے دس ہزار روپے دیئے تھے جس کے نام کا کتبہ اشتہار کے مطابق ان ایک سو بیس کتبوں کے سب سے اوپر لگایا جاتا تھا، لیکن اس مرد خدا نے دنیاوی نام و نمود سے بالا ہو کر اپنے نام کا کتبہ لگوانا پسند نہیں کیا۔ لہٰذا سرسید کی وفات تک یہ مقام خالی رہا اور عام لوگ یہی سمجھتے رہے کہ شاید ابھی تک کسی نے دس ہزار روپے کا عطیہ نہیں دیا۔ سرسید کی وفات کے بعد سید محمود نے اس کا حل یہ نکالا کہ اس مقام پر ایک کتبہ لگوادیا جس پر لکھوادیا "اسمہٗ احمد" یعنی "اس کا نام احمد ہے۔" اس میں بڑی حکمت پوشیدہ تھی۔ یعنی سرسید کا اصل نام بھی احمد تھا، اس مرد خدا کا نام بھی احمد تھا، اور نبی کریم کا نام بھی احمد تھا۔ اس لئے صرف "احمد" کے نام کا کتبہ لگوانے پر اس مرد خدا کو بھی کوئی اعتراض نہ ہوا۔ وہ مرد خدا علی گڑھ کا مشہور وکیل سید احمد حسین تھا۔ میر ولایت حسین نے بھی اپنی اس کتاب میں اس طرف اشارہ کیا ہے جس کا نام ہے "میرے پچاس سال علی گڑھ میں" اسٹریچی ہال کی لمبائی

تقریباً ۱۰۷ فیٹ ہے، چوڑائی تقریباً ۸۱ فیٹ ہے اور اونچائی تقریباً ۵۴ فیٹ ہے۔ اس میں تقریباً سات ہزار مربع فیٹ کا رقبہ شامل ہے جس میں ہال کا اندرونی رقبہ تقریباً پانچ ہزار مربع فیٹ ہے۔ یہ عمارت تقریباً نوے ہزار روپے میں مکمل ہوئی تھی۔

(۳) سالار منزل:۔ سرسید ہال کے مشرقی گوشے میں جو بڑا ہال ہے اسے سالار منزل کہتے ہیں۔ یہ دراصل سرسید ہال کا ڈائننگ ہال ہے۔ اس کی تعمیر میں حیدر آباد دکن کے جناب سالار جنگ نے بہت مدد کی تھی اس لئے ان کے نام پر اس کا نام سالار منزل رکھا گیا اور اس کا افتتاح سرسید کی ۶۸ ویں سال گرہ پر ۱۷ اکتوبر ۱۸۸۵ء کو ہوا تھا۔

(۴) لٹن لائبریری:۔ جب ہم اسٹریچی ہال کے قریب پہنچتے ہیں تو اس سے متصل ہی ایک بہت بڑی عمارت نظر آتی ہے۔ یہی لٹن لائبریری ہے۔ ۸ جنوری ۱۸۷۷ء کو جب وائسرائے ہند لارڈ لٹن علی گڑھ کالج کا افتتاح کرنے آئے تھے تو اسی موقع پر سرسید نے اعلان کر دیا تھا کہ کالج لائبریری کا نام لٹن لائبریری ہوگا۔ اس لائبریری کی تعمیر ۱۸۸۱ء میں شروع ہوئی اور ۱۹۰۹ء میں مکمل ہوئی۔ تقسیم ہند کے بعد بھارتی حکومت نے اس کا نام "مولانا ابوالکلام آزاد لائبریری" رکھ دیا ہے۔

(۵) جامع مسجد:۔ سرسید ہال کی عمارتوں میں سب سے زیادہ دلکش عمارت وہاں کی جامع مسجد ہے۔ اس کی جائے وقوع کو ۱۸۷۹ء میں سرسید نے خود منتخب کیا تھا۔ اس کی خشتِ اول سید محمود کے ہاتھوں رکھی گئی تھی اور یہ مسجد فروری ۱۹۱۵ء میں مکمل ہوئی تھی۔ مسجد کے احاطے کے شمالی حصے میں محمود منزل اور سید محمود کا مقبرہ ہے۔ اس کے بعد سرسید کی تربت ہے۔ سرسید کا مقبرہ ان کے رفیق سید زین العابدین کی نگرانی میں تیار ہوا۔ یہیں پر سر راس مسعود، ڈاکٹر ضیاء الدین احمد، محسن الملک اور سید زین العابدین بھی مدفون ہیں۔

(۶) نظام میوزیم:۔ یہ عمارت ۱۹۰۳ء میں مکمل ہوئی لیکن اس کا منصوبہ سرسید کے زمانہ ہی میں بن چکا تھا کیونکہ ۱۸۷۵ء میں ریاست حیدر آباد دکن کی طرف سے دو

ہزار دو سو روپیہ سالانہ کی امداد شروع کی گئی تھی جو رفتہ رفتہ ١٨٩١ء میں چوبیس ہزار روپیہ سالانہ کر دی گئی۔ اس امداد کے تشکر کے طور پر نظام میوزیم بنایا گیا۔

(٧) آسمان منزل:- یہ عمارت ١٩٠٣ء میں مکمل ہوئی لیکن اس کی ابتداء ١٨٨٨ء ہی میں ہو گئی تھی جب کہ حیدر آباد دکن کے وزیر اعظم سر آسمان جاہ علی گڑھ تشریف لائے تھے اور کافی امداد بہم پہنچائی تھی۔

(٨) مہدی منزل:- یہ عمارت ١٨٨١ء میں بننی شروع ہوئی اور سرسید کے زمانے میں ہی بن کر تیار ہو گئی تھی۔

(٩) برکت علی خاں لیکچر روم:- یہ عمارت سرسید کے زمانے میں شروع ہوئی اور ١٩٠٣ء میں مکمل ہوئی۔ برکت علی خاں نے مالی امداد بہم پہنچائی تھی۔

(١٠) بیک منزل:- اس عمارت کی تعمیر کا کام ١٨٨٧ء میں شروع ہو کر جلد ہی مکمل ہو گیا تھا۔ اس کا نام دار العلوم کے پرنسپل تھیوڈور بیک صاحب کے نام پر رکھا گیا تھا۔

(١١) آدم جی پیر بھائی منزل:- یہ عمارت بمبئی کے ایک سیٹھ کے نام پر شروع ہوئی تھی اور ١٩٠٣ء میں مکمل ہوئی تھی۔ اسی سیٹھ نے روپیہ دیا تھا۔

(١٢) تصدق رسول عربک روم:- حسن گیٹ سے متصل یہ روم راجہ تصدق رسول کے چندہ سے تعمیر ہوا اور عربی کے درس کے لئے مخصوص ہے۔ یہ ١٩٠٥ء میں مکمل ہوا۔

(١٣) حمید اللہ خاں لیکچر روم:- لارنس گیٹ سے متصل اس روم کی بنیاد ١٨٨٦ء میں پڑی اور حمید اللہ خاں کے دوستوں نے چندہ دیا۔ حمید اللہ خاں کالج کے پہلے بیچ سے تعلق رکھتے تھے، اور بڑے ہر دلعزیز علیگیرین تھے۔

(١٤) پکی بارک:- یہ پکی بارک آج کل سید محمود کورٹ کہلاتی ہے۔ کسی

زمانہ میں اس بارک میں ستر عدد کچے کمرے تھے۔ ۱۹۰۷ء میں اس کے پچیس کمروں کو پختہ بنادیا گیا۔ ۱۹۱۳ء میں مزید دس کمرے پختہ بنادیے گئے۔ ۱۹۱۸ء میں جب نظام دکن علی گڑھ آئے تو انہوں نے باقی کمروں کو بھی پختہ کرادیا۔ اب یہ کچی بارک نہیں رہی بلکہ پختہ بارک ہو گئی ہے لیکن تاریخی اعتبار سے یہ اب بھی کچی بارک ہی ہے۔ اسی طرح سرسید کورٹ کے مشرقی گوشے کے چونتیس کمرے ۱۸۸۳ء کے اواخر تک مکمل ہو چکے تھے۔ ان کمروں کی تعمیر کے لئے اتنے ہی لوگوں نے فرداً فرداً چندہ دیا تھا۔

مندرجہ بالا خاص خاص عمارتوں کے علاوہ اور بھی کئی عمارتیں قدیم حیثیت کی ہیں لیکن ان کا ذکر چھوڑ دیا گیا ہے۔ بہت سی بالکل نئی عمارتیں بھی ہیں لیکن ان کا ذکر بھی ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ البتہ وہ عمارت بھی بہت مقبول تھی جس میں یونیورسٹی کا سائرن رکھا ہوا تھا۔ یونیورسٹی کے سائرن کی آواز بھی بڑی پرکشش تھی جو علی گڑھ شہر تک پہنچتی تھی۔ ٹائم شروع ہونے اور ٹائم ختم ہونے پر ہر طرف سائرن کی آواز گونجتی تھی۔ جب بھی کئی سائرن یکے بعد دیگرے بجائے جاتے تھے تو سننے والوں کے دل دہل جاتے تھے کیونکہ یہ اس بات کی علامت تھی کہ کوئی بہت ہی اہم شخصیت اس دار فانی سے رخصت ہو گئی ہے۔

———— ☆ ————

سرسید کو خراج تحسین

سرسید کے تعلیمی، اصلاحی اور قومی کارناموں کو ساری دنیا نے سراہا ہے۔ ان کی زندگی میں بھی تمام سمجھدار مسلمان انکی تعریفیں کرتے رہتے تھے اور ان کی وفات پر بھی سیکڑوں لوگوں نے انہیں خراج تحسین پیش کیا جن میں غیر قوموں کے لوگ بھی شامل ہیں۔ آئندہ بھی رہتی دنیا تک سرسید کو عقیدت کے نذرانے پیش ہوتے رہیں گے۔ سرسید کو اپنے زمانے میں خوش قسمتی سے کچھ ایسے مخلص ساتھی مل گئے تھے جنھوں نے ان کی علی گڑھ تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے اپنی اپنی استطاعت کے مطابق بہت کچھ کام کیا۔ محسن الملک، وقار الملک، سمیع اللہ خاں، ظہور حسین، زین العابدین، چراغ علی، خلیفہ محمد حسین، مولوی نذیر احمد، مولانا الطاف حسین حالی، اور شبلی نعمانی وغیرہ نے ہر کام میں سرسید کا ہاتھ بٹایا، اور سرسید کے ہر کام پر تحسین و آفرین پیش کی۔ سرسید کی حمایت میں اتنے علماء ایک جگہ جمع ہو گئے تھے کہ اجتہاد کی فضاء بھی پیدا ہو گئی تھی جس نے سرسید کے اصلاحی کاموں میں بڑی آسانیاں پیدا کر دی تھیں۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو سرسید کے پاس اکثر حاضر رہتے تھے اور ان کے ہر حکم کی دل سے تعمیل کرتے تھے اور انہیں خراج تحسین بھی پیش کرتے رہتے تھے مثلاً میر ولایت حسین جنھوں نے علی گڑھ میں پچاس سال گزارے تھے۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنھوں نے اپنے حالات اور اپنی افتادِ طبع کے پیش نظر سرسید کے ساتھ عملی جدوجہد میں تو حصہ نہیں لیا لیکن مالی امداد خاموشی کے ساتھ پہنچاتے رہے اور اپنا نام کبھی ظاہر نہیں ہونے دیا تاکہ عقبیٰ کے ثواب میں کمی نہ ہونے پائے مثلاً علی گڑھ شہر کے سید احمد حسین وکیل جنھوں نے ہمیشہ سرسید کے ہر تعمیری کام میں جتنے روپے کی کمی پڑی وہ کسر پوری کی۔ سرسید نے کچھ انگریز پروفیسروں کو بھی اعلیٰ تعلیم کی تدریس کیلئے علی گڑھ میں ملازم رکھا تھا مثلاً مسٹر بیک، مسٹر موریسن، مسٹر ریلے اور مسٹر آرنلڈ وغیرہ۔ جنھوں نے طلبہ میں گھل مل کر بے تکلفی کا سا ماحول پیدا کر رکھا تھا۔ ان سب لوگوں نے علیحدہ علیحدہ

اپنے مخصوص انداز میں سرسید کی تعریفیں کی ہیں اور انہیں خراج تحسین پیش کیا ہے۔ بہت سے اور بھی ملکی اور غیر ملکی لوگوں نے سرسید کو دل کھول کر داد دی ہے۔ اگر سب لوگوں کی تعریفوں کو تفصیل سے بیان کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب بن جائے۔ اس لئے صرف چند نمونے یہاں پیش کئے جا رہے ہیں جو بہت مختصر ہیں لیکن سرسید کی بہت سی خوبیوں کو اجاگر کرتے ہیں۔

کرنل گریہم کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ انہوں نے سرسید کی وفات سے تیرہ سال پہلے ان کی لائف لکھ کر شائع کرائی تھی۔ وہ لکھتے ہیں "میں سرسید کو ایک چوتھائی صدی سے جانتا ہوں۔ میرا اور ان کا تعلق بمنزلہ ایک رشتہ دار کے ہے نہ کہ بطور ایک دوست کے۔ جتنی زیادہ ان کی میری واقفیت بڑھتی گئی اتنی ہی ان کی قدر و منزلت میرے دل میں زیادہ ہوتی گئی۔" سر ہملٹن گب نے سرسید کی تحریک کو "اسلام میں پہلی بار جدیدیت کی تنظیم" کہا تھا۔ لندن کے اخبار ٹائمز نے لکھا تھا "سرسید اپنے ہم مذہبوں کی حمایت میں ان کو سائنس کے حملوں سے بچانے کے لئے ہمیشہ تیار رہے ہیں اور خود ہمارے کالموں نے اور بڑے بڑے میگزینوں نے ان کی اس علمی اور منطقی لیاقت کی شہادت دی ہے جو انہوں نے اپنی قوم کی حمایت میں ظاہر کی.... کسی شخص نے ہندوستان کے مسلمانوں کے بیدار کرنے اور ان کو اپنے تنزل اور خاص کر تعلیم کے ضروری معاملہ کا خیال دلوانے میں ان کے کام کا دسواں حصہ بھی نہیں کیا۔"

پروفیسر آرنلڈ نے انجمن اسلامیہ لاہور کے ایک جلسہ میں سرسید پر ایک طویل تقریر کی جس کا تھوڑا سا حصہ یہاں نقل کیا جاتا ہے "تاریخ سے معلوم ہوگا کہ دنیا میں بڑے آدمی اکثر گزرے ہیں لیکن ان میں بہت کم ایسے نکلیں گے جن میں یہ حیرت انگیز لیاقتیں اور اوصاف مجتمع ہوں۔ وہ ایک ہی وقت میں اسلام کا محقق، علم کا حامی، قوم کا سوشل ریفارمر، پولیٹیشین، مصنف اور مضمون نگار تھا۔ اس کا اثر اس عالم کا سا نہ تھا جو گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر اپنی تحریروں سے لوگوں کے دل اکسائے بلکہ وہ علانیہ لوگوں کے سامنے لوگوں کا رہبر بن کر

اس لئے آیا کہ جس بات کو سچ اور صحیح سمجھے اگر اس کی دنیا مخالف ہو تو ساری دنیا سے لڑنے کے لئے ہر وقت تیار اور آمادہ رہے۔ ہندوستان میں ہم کو ایسے شخص کی مثال جیسا کہ وہ تھا کہاں مل سکتی ہے کہ نہ جاہ و مرتبہ تھا، نہ دولت تھی۔ باوجود اس کے ہندوستان میں مسلمانوں کی قوم کا سردار بن کر ظاہر ہوا۔ یہ وہ رتبہ ہے جو اس سے پہلے کسی شخص کو بغیر تلوار کے زور کے حاصل نہیں ہوا۔ سرسید نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ کاہلی، غفلت، جہالت اور ذلت سے جن میں وہ مبتلا تھے اپنے تئیں نکالیں اور دیکھو اس کی پکار پر ایک نئی نسل اٹھ کھڑی ہوئی۔ لوگوں نے سرسید کو جھوٹا سمجھا، ان کی باتوں کو بدنیتی پر محمول کیا اور چاروں طرف سے ان پر طعن و تشنیع کی بوچھار ہوئی مگر اس نے تمام مخالفوں کو سامنے سے ہٹایا اور راستے کی تمام خس و خاشاک کو صاف کرتا ہوا اس منزل کی طرف سیدھا ہو لیا جس پر پہنچنا مقصود تھا۔" سر تھیوڈور موریسن نے فرمایا تھا "میرا اپنا خیال ہے کہ میں سرسید سے زیادہ بڑے آدمی سے کبھی نہیں ملا۔"

یہ بھی ایک منفرد واقعہ ہے کہ سرسید کی وفات پر انگلستان کی ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون نے ایک مرثیہ نما "سانیٹ" لکھا تھا جس کا ترجمہ یہ ہے "ایک تناور درخت جہاں کھڑا تھا وہیں گر پڑا۔ اس کی سایہ دار شاخیں جو چاروں طرف دور تک جھومتی تھیں، صحت بخش شبنم ان سے ٹپکتی تھی، اور انہوں نے کثرت سے بیج بکھیرے تھے، ان کے سائے میں بنجر زمین اصلاح پا گئی۔ بیج پھوٹ نکلے، شگفتہ و شاداب پھول کھلنے لگے اور خوبصورت نونہالوں نے جو طاقت اور حسن سے آراستہ تھے اس ویران ریگستان کو گلزار بنا دیا۔ روؤ۔ اب اس شاہانہ درخت کے لئے کہ اجل نے اس کو گرا دیا ہے۔ غم کرو مگر امید کے ساتھ کیونکہ اس کی ہری بھری کھیتیاں جو اس کی سالہا سال کی محنت کا ثمرہ ہیں اس کی قبر کے گرد لہلہا رہی ہیں۔ جن نونہالوں کو اس نے اپنی چھاؤں میں پرورش کیا تھا وہ پھول رہے ہیں اور پھیل رہے ہیں۔ یہ نونہال بھی اسی کی مانند زندہ رہیں گے تاکہ کسی ویرانے کو گلزار بنا جائیں۔"

سر جان اسٹریچی کے چند الفاظ یہاں نقل کئے جاتے ہیں جو انہوں نے ہندوستان

سے رخصت ہوتے وقت کہے تھے "شمال مغربی اضلاع میں سرسید سے زیادہ کوئی روشن ضمیر جج نہیں ہوا" مسٹر شیکسپیئر نے اپنی رپورٹ میں اعتراف کیا تھا کہ "اگر صدر امین (یعنی سرسید) بیچ میں واسطہ نہ ہوتا تو ہماری جانیں نواب محمود خاں کا شکار ہو جاتیں" ایک باحیثیت اور شریف انگریز نے کہا تھا کہ "یورپ میں بلاشبہ ایسے لوگ کثرت سے پائے جاتے ہیں جو کسی خاص علم یا فن میں فرد کامل ہیں اور جن کا نظیر ایشیا میں ملنا مشکل ہے لیکن ایسے جامع حیثیات اشخاص جیسے کہ سید احمد خاں ہیں وہاں بھی کمیاب بلکہ نایاب ہیں۔" ایک لائق اور فائق پنڈت نے کہا تھا کہ "ہم مسلمانوں سے دولت میں زیادہ ہیں، تعلیم میں زیادہ ہیں، تعداد میں زیادہ ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ ہم میں، کوئی سید احمد خاں نہیں ہے۔ بلکہ اگر ہم دس بھی مل کر ایک ہو جائیں تو بھی سید احمد خاں کے برابر نہیں ہو سکتے۔" مسٹر بیک نے کہا تھا کہ "گو اس کی لیاقتیں بہت اعلیٰ تھیں لیکن اس کے اخلاق ان سے بھی اعلیٰ تھے۔" مسٹر ہنٹر نے کہا تھا کہ "لوگ اس پر یقین رکھتے تھے کیونکہ وہ اپنے پر یقین رکھتا تھا۔" ریورینڈ ہویر نے لکھا تھا کہ "مسلمانوں پر تعجب ہے کہ وہ سرسید کو کافر و ملحد و بد مذہب سمجھتے ہیں مگر ہمارے نزدیک جو کام سرسید نے حمایت اسلام میں کیا وہ آج تک کسی اور مسلمان سے نہ بن پڑا۔" کرنل گریہم نے لکھا تھا کہ "سرسید کا غیر معمولی تعمق نظر، غیر مذاہب سے بے تعصبی اور اصل عیسائیت کے سچے اصولوں کا ادب و احترام یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس نے سر ولیم میور کی کتاب "لائف آف محمد" پر بہت عمدہ تنقید کی ہے اور خوب چٹکیاں لی ہیں۔" غرض یہ کہ غیر قوموں کے لوگ بھی سرسید کے بہت زیادہ مداح تھے۔ جب سرسید کی وفات ہوئی تھی تو پورا ہندوستان ماتم کدہ بن گیا تھا۔

سرسید کی وفات پر حالیؔ نے کہا "سرسید کیا گئے ایک برگشتہ قسمت قوم کا سرمایہ، ایک نادار ملک کا گنج بے بہا اور میرا مرشد، رہبر اور دوست جاتا رہا۔۔۔۔ اب یہ لیل و نہار دوسرا سید احمد پیدا نہ کر سکیں گے" محسن الملک نے کہا "مجھے صرف ان کی ذات سے ہی محبت نہیں تھی بلکہ پچاس سالہ تجربہ نے یہ بات میرے دل پر نقش کر دی تھی کہ قومی درد اور بھی

خواہی کو جب خدا تعالیٰ نے ایک جسم اور شکل دینی چاہی تو سید احمد اس کا نام رکھ دیا۔ جلوت و خلوت، تنہائی و یکجائی، دن رات، صبح شام، جب میں نے ان کو دیکھا اسی حال میں دیکھا۔ ہم لوگ ان کے پیرو اور دوست کہلاتے تھے مگر میں سچ کہتا ہوں کہ جو قومی درد اور قومی محبت سرسید میں تھی اور وہ آگ جو ان کے دل میں لگی ہوئی تھی اور وہ درد جس سے ان کا دل بھرا ہوا تھا ہم میں اس کا نشان بھی نہیں ہے۔ ان میں یہ سب باتیں فطری تھیں اور ہم میں مصنوعی، سرمگیں آنکھ اور چیز ہے، اور سرمہ لگانا اور بات ہے۔" مولانا عبدالحلیم شرر کا بیان ہے کہ "سید صاحب کے پاس بعد کے زمانہ میں متعدد انگریزی داں طلبہ کے ایسے خطوط آئے جن کا ماحصل یہ تھا کہ اگر آپ نے ہماری رہبری نہ کی ہوتی تو ہم مذہب اسلام کے چھوڑنے کو تیار تھے" مولوی نذیر احمد نے کہا "میرے دل میں ان کی ایسی عظمت ہے کہ اگر میں ان کے تمام عقائد سے اتفاق رکھتا اور مجھ کو پیر کی تلاش بھی ہوتی تو میں ضرور ان کے ہاتھ پر بیعت کر لیتا" علامہ اقبال نے کہا "غالباً وہ (یعنی سرسید) دور جدید میں پہلے مسلمان ہیں جس نے آنے والے زمانہ کے ایجابی مزاج کی ایک جھلک دیکھ لی لیکن ان کی حقیقی عظمت اس میں ہے کہ وہ پہلے ہندوستانی ہیں جس نے اسلام کی نئی تعبیر کی ضرورت کو محسوس کیا اور اس کے لئے سعی کی" خالدہ ادیب خانم نے لکھا "سرسید کو کسی بھی پہلو سے دیکھا جائے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک بڑا سا پتھر ہندوستان کی اسلامی سوسائٹی کے ٹھہرے ہوئے پانی میں لڑھکا دیا گیا ہو، اس نے جو لہریں اٹھائی ہیں وہ اب تک حرکت میں ہیں" مولانا ابوالکلام آزاد نے کہا "جو آواز آج سے تیس چالیس برس پیشتر اس اسلامی دور کے آخری مجدد (یعنی سرسید) کی زبانی سرزمین ہند سے بلند ہوئی تھی آج مصر، استنبول اور خود ہندوستان کے ہر روشن خیال اور تعلیم یافتہ شخص کی زبان پر ہے۔" یہاں تک کہ بھارت کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کو بھی ماننا پڑا کہ "مغربی تعلیم کی طرف مسلمانوں کو راغب کرنے کا سرسید کا عمل صحیح سمت میں ایک اہم قدم تھا.... سرسید کی سرگرمیاں اگرچہ بڑی معتدل نظر آتی تھیں لیکن در حقیقت وہ ایک عظیم انقلاب کی رہنمائی کر رہی تھیں۔"

مولانا حالیؔ تمام عمر سرسید کو ملک و قوم کا قافلہ سالار اور علی گڑھ کو مسلمانوں کی نئی زندگی کا مرکز سمجھتے رہے۔ انھوں نے سرسید کی مدح میں بہت سے اشعار کہے تھے جن میں سے چند اشعار ذیل میں درج ہیں۔

تمہیں کہتا ہے مردہ کون تم زندوں کے زندہ ہو
تمہاری خوبیاں زندہ تمہاری نیکیاں باقی

بعد از قرون لوئی کس نے کیا بتاؤ
سید نے کام آکر جو قوم کا کیا تھا

اگر باور نہ ہو اخلاص سنی اور شیعہ کا
بہم شیر و شکر یاں چار یار و پنجتن دیکھیں

زیستن در فکر قوم و مردن اندر بند قوم
گر توانی میتواں سرسید احمد خاں شدن

مولانا محمد علی جوہرؔ نے تحریک خلافت کے زمانہ میں سرسید کو مخاطب کر کے کہا تھا۔

سکھایا تھا تمہیں نے قوم کو یہ یہ شور و شر سارا　　جو اس کی انتہا ہم ہیں تو اس کی ابتداء تم ہو

علامہ اقبال نے ایک مکمل نظم "سید کی لوح تربت" کے عنوان سے کہی تھی۔ ایک اور مقام پر علامہ اقبال سرسید کی مسیحائی کا ذکر کرتے ہوئے انھیں خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔

آں لالۂ صحرا کہ خزاں دید و فسرد　　سید دگر اور انمی از اشک سحر داد

خوشی محمد ناظرؔ نے سرسید کی وفات پر کہا۔

ہائے بزم قوم میں اب جلوہ فرمائے گا کون
ماہ کی مانند ہالے میں نظر آئے گا کون

یوں تو لاکھوں آئیں گے اس بزم میں اور جائیں گے
سید احمد سا جنوں ساماں مگر آئے گا کون

مولوی نذیر احمد نے فرمایا ۔

وہ اپنے وقت کا اک فرد کامل بحد اکمل تھا
کہ ہم میں سے کا اک اعلیٰ سے اعلیٰ اس سے اسفل تھا
خرد مندوں کی صف میں سب مؤخر تھے وہ اول تھا
غرض اسلامیوں کی فوج کا لیڈر تھا جنرل تھا
اب اس کے بعد لشکر ہے مگر افسر نہیں کوئی
بھٹکتا پھر رہا ہے قافلہ رہبر نہیں کوئی

اکبر الٰہ آبادی پہلے تو سرسید کی علی گڑھ تحریک کے مخالف تھے لیکن جب انہوں نے سرسید کے خلوص کو دیکھا تو وہ سرسید کے حامی ہو گئے۔ انکا خراج تحسین ذیل میں درج ہے۔

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سید کام کرتا تھا
نہ پوچھو فرق جو ہے کہنے والے کرنے والے میں
کہے جو چاہے کوئی میں تو یہ کہتا ہوں اے اکبر
خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

صدمے اٹھائے رنج سے گالیاں سنیں
لیکن نہ چھوڑا قوم کے خادم نے اپنا کام
نیت جو تھی بخیر تو برکت خدا نے دی
کالج ہوا درست بصد شان و اہتمام
مفر نہیں ہے ہمیں خانقاہ سید سے
قفس میں ہیں تو اس اڈے کو چھوڑ جائیں کہاں
ہے یہی بہتر علی گڑھ جا کے سید سے کہوں
مجھ سے چندہ لیجئے مجھ کو مسلماں کیجئے

شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد دہلوی نے سرسید احمد خان کی شان میں ستائیس اشعار

کی ایک دعائیہ نظم کہی تھی۔ اس نظم کے صرف چھ اشعار ذیل میں دیئے جا رہے ہیں۔ ان اشعار سے ظاہر ہوگا کہ مسلم قوم کے دانشوروں کے ذہنوں پر سرسید کی شخصیت کے نقوش کتنے گہرے تھے۔

چلایا ڈوبنے سے کشتیٔ دین محمد کو
الٰہی نوح کی سی عمر دے سر سید احمد کو

ہمیں احساں شناسی شکر پر مجبور کرتی ہے
وگرنہ ہم کمینہ پن سمجھتے ہیں خوشامد کو

تعصب ہی ترقی میں مسلمانوں کی حارج تھا
جزاک اللہ کس خوبی سے سرکایا ہے اس سد کو

کسی ڈھب سے انھیں تعلیم کے رستے پہ لا ڈالا
اگر اب بھی نہ سمجھیں یہ تو روئیں قسمت بد کو

کیا تھا پاک اس کے جد امجد نے سنا ہوگا
بتوں کی گندگی سے خانۂ کعبہ کے معبد کو

سو اس نے بھی دلوں سے دھو دیا اوہام باطل کو
کہ اس کا فرض تھا پھر زندہ کرنا سنتِ جد کو

خود سرسید نے اپنے خلاف کفر کے فتووں کے پس منظر میں اپنے مشرب پر فخر کرتے ہوئے کہا تھا۔

خدا دارم دل بریاں زعشق مصطفیٰ دارم
ندارد ہیچ کافر ساز و سامانے کہ من دارم

یہ بھی ایک عجیب و غریب حقیقت ہے کہ کئی مقتدر ہستیوں نے سرسید کی تاریخ وفات یعنی ۱۳۱۵ ہجری کے جو مادے نکالے ہیں ان سے واضح طور پر یہ اشارے ملتے ہیں کہ سرسید مرحوم کو مغفرت بھی حاصل ہو گئی، طہارت بھی حاصل ہو گئی اور رفعت بھی حاصل

ہو گئی۔ مثال کے طور پر علامہ اقبالؔ کے استاد شمس العلماء میر حسن نے سرسید کا جو مادّہ تاریخ نکالا تھا وہ تھا "غفرلہ" یعنی "اس کی مغفرت ہو گئی" خود علامہ اقبال نے جو مادّہ تاریخ نکالا تھا وہ تھا "اِنّی مُتَوَفِّیکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ وَمُطَہِّرُکَ" اس آیہ قرآنی کا مفہوم بھی یہی ہے کہ "ہم نے تجھے وفات دی، اور تجھے اپنی طرف رفعت دی، اور تجھے طہارت بخشی۔" علامہ اقبالؔ اس زمانے میں گورنمنٹ کالج لاہور کے طالب علم تھے اور اس مادہ تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ شروع ہی سے علامہ اقبالؔ کی نظر میں سرسید کی منزلت بہت عظیم تھی۔

☆

maablib.org

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور پاکستان

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے سرسید نے ۱۸۷۵ء میں علی گڑھ میں مدرسۃ العلوم یعنی محمڈن اینگلو اورینٹل اسکول کی بنیاد ڈالی جو بہت جلد ۱۸۷۷ء میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میں تبدیل ہو گیا اور پھر یہی علی گڑھ کالج سرسید کی وفات کے بائیس سال بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بن کر ابھرا۔ یہ اسی خواب کی تعبیر تھی جو سرسید نے ۱۸۷۲ء میں دیکھا تھا۔ اس یونیورسٹی کی تشکیل میں سرسید کے قابل صاحبزادہ سید محمود کا سب سے بڑا ہاتھ تھا جنہوں نے اپنے والد کے ہمراہ انگلستان جا کر اور وہاں اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے لئے انہی خطوط پر پلاننگ کی تھی جن خطوط پر آکسفورڈ اور کیمبرج کی یونیورسٹیاں قائم تھیں۔ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ علی گڑھ کی تعمیر میں سرسید کے ساتھ ساتھ سید محمود کا بھی بہت بڑا ہاتھ تھا۔ غرض یہ کہ ۷ ادسمبر ۱۹۲۰ء کی صبح کو علی گڑھ کالج کے اسٹریچی ہال میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی رسم افتتاح کی شاندار تقریب ہوئی، اور اس یونیورسٹی کے سب سے پہلے وائس چانسلر آنریبل سر محمد علی محمد خاں راجہ صاحب محمود آباد نے ایک طویل اور بصیرت افروز خطبہ صدارت پیش کیا جس میں یونیورسٹی کے ارتقائی مرحلوں کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا تھا۔ اس معرکۃ الآرا خطبہ صدارت کے کچھ اہم حصے اختصار کے ساتھ ذیل میں درج کئے جاتے ہیں جو نہایت ضروری ہیں۔ "محترمان قوم و بزرگان ملت! آج ہم ایک بہت بڑا اہم کام انجام دینے اور ایک علمی نعمت پر اظہار شکر و مسرت کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ مسلمانوں کے لئے ایک اعلیٰ تعلیم گاہ یا کسی زبردست مرکز علم کو کوئی نیا مایہ فخر و ناز نہ ہونا چاہئے۔ ہم وہ لوگ ہیں کہ صدیوں تک علم نے ہمارے آغوش میں اور ہم نے علم کے آغوش میں نشو و نما پایا۔ مشرق سے مغرب تک ہمارے دارالعلوم پھیلے ہوئے تھے اور موجودہ یورپ کی تعلیم کی بسم اللہ ہمارے ہی مکاتب و مدارس میں ہوئی تھی۔ مگر ہاں گزشتہ چند آخری صدیوں نے ہمیں ایسی جہالت کی تاریکی میں ڈال دیا

تھا کہ علم و فضل نے ہمارا ساتھ چھوڑ دیا، جہالت کا غلبہ ہوا اور وہ ساری دولت علم ہم سے چھین گئی۔ نہ وہ اعلیٰ درسگاہیں رہیں نہ وہ مستند روزگار علماء و فضلاء۔ لہٰذا یونیورسٹی ہمارے لئے کوئی نئی نعمت و برکت نہیں، بلکہ ہماری ایک کھوئی ہوئی دولت ہے جس کو مدتوں کی ناکامی و نامرادی (بلکہ یاس و حرماں) کے بعد اب ہم پھر پاتے ہیں اور سچ یہ ہے کہ اکثر اوقات کسی نئی دولت کے ملنے پر انسان کو اتنی مسرت نہیں ہوتی جتنی کہ اپنی کسی کھوئی ہوئی چیز کے ملنے پر ہوا کرتی ہے۔ ...... برٹش گورنمنٹ اپنے ساتھ یورپ کے جدید فنون اور نئے مسائل لائی۔ ہمارے اہل علم یا تو یہ سمجھے ہوئے تھے کہ جن عقلی علموں کو ہم حاصل کرتے ہیں وہ ساری دنیا میں مقبول و مسلم ہیں اور کسی کو ان کی مخالفت کی جرأت نہیں ہو سکتی، یا یک بیک یہ نظر آیا کہ دنیا کے غالب گروہ کو ہمارے مسلمہ مسائل اور ہمارے علوم کی سچائی سے اختلاف ہے اور مغرب کے نئے دور نے ہمارے علموں کو بدل کے کچھ سے کچھ کر دیا ہے۔ انہوں نے غلطی سے یہ سمجھا کہ انگریزوں نے ہمارے ملک ہی کو نہیں فتح کیا بلکہ ہمارے دین اور ہمارے علموں کو بھی فتح کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ علماء نے اس علمی انقلاب کو حیرت کی نگاہ سے دیکھا اور کسی طرح ان کی سمجھ ہی میں نہ آتا تھا کہ عناصر چار سے بیسیوں کیسے ہو گئے؟ آسمان جس میں خرق والتیام محال تھا محض خالی فضا کا کام کیوں رہ گیا؟ اور کیونکر تسلیم کیا جائے کہ ستارے زمین کے گرد نہیں پھرتے بلکہ خود زمین آفتاب کے گرد حرکت کر رہی ہے؟ ان کی یہ حیرت بے جا نہ تھی کیونکہ جس وقت ہم نے یونان و روم کے علمی دفتروں کو کھنگالا ہے اس وقت تک وہاں کے لوگ بھی یہی کہہ رہے تھے جو ہم کہتے ہیں۔ بہر حال ہمارے تمام علماء نے ان نئے مسائل اور جدید فنون کے ماننے سے انکار کر دیا اور اپنے اصول اور اپنی فہم کے مطابق ان کی تردید کرنے لگے۔ پھر اس کے بعد ان کی برہمی اور بڑھ گئی جب برٹش گورنمنٹ نے اپنے وہ نئے علوم و فنون ہندوستانی مدارس کی تعلیم میں داخل کر دیئے اور ملازمت ترقی تعلیم سے وابستہ ہو گئی۔ ہمارے علماء اپنی ضد نہ چھوڑتے تھے۔ رد و ابطال میں ہر قسم کے نقلی و عقلی حربوں سے کام لینے لگے اور اس زبردست قوت سے سر ٹکرانا شروع کیا جو ان کے بس کی نہ

تھی۔ اسکی ضد سے عام مسلمانوں کو یہ نقصان پہنچ رہا تھا کہ اپنے دینی مقتداؤں کی مخالفت کے باعث وہ بھی سرکاری مدارس کی تعلیم سے الگ ہو کر ہندوستان کی ان ہم عصر قوموں سے بالکل پیچھے رہے چلے جاتے تھے جنھوں نے بلاپس و پیش انگریزی مدارس کی تعلیم کو اختیار کر لیا تھا۔ خدا اغریق رحمت کرے سرسید مرحوم کو کہ انھوں نے مسلمانوں کی اس غفلت کو دیکھا، اس کے خوفناک نتائج کو سمجھا اور فوراً مستعدی کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے کہ اپنی قوم کو اس عاقبت نااندیشی کی مضرت سے بچائیں۔ ان کی اسی کوشش کی یادگار آپ کا یہ عظیم الشان کالج ہے جو آج ان کے حسن سعی اور خلوص نیت کے صلے میں آپ کی قوم کا علمی مرکز اور ایک عالیشان یونیورسٹی بن رہا ہے.... اس کالج کا یونیورسٹی بننا اگرچہ سرسید کی اصلی تمنا تھی اور اس کا پورا خاکہ ان کے فاضل اور نامور فرزند سید محمود مرحوم نے ان کی زندگی ہی میں تیار کر دیا تھا مگر اس خیال کا عملی صورت میں ظہور سرسید مرحوم کے انتقال کے بعد ان کی یادگار کے طور پر مسٹر بیک اور نواب محسن الملک مرحوم کی کوشش سے ہوا.... اب میں اپنی تقریر اس دعا پر ختم کرتا ہوں کہ رب العزت ہماری اس قومی درسگاہ کو مسلمانان ہندوستان کی حقیقی فلاح اور بہبود اور اعزاز و احترام کا ذریعہ گردانے۔ ان کے دلوں میں اعلیٰ تعلیم کا سچا شوق پیدا کرے ان کو قومیت کا صحیح مفہوم سکھلائے جو ہندو مسلمان کے مفید اتفاق و اتحاد اور میل ملاپ کا باعث ہو اور یہ مبارک اتحاد جو بالفعل قائم ہو گیا ہے اس میں یوماً فیوماً ترقی اور زیادہ نصیب ہو، آمین"

یہ وہی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ہے جس نے ہر نازک موڑ پر مسلم قوم کی رہبری و اعانت کی اور جب قائداعظم محمد علی جناح نے ہندوستانی مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ خود مختار ملک پاکستان بنانے کے لئے مسلم قوم کو پکارا تو اسی یونیورسٹی کے فرزندوں نے اپنا سب کچھ قربان کر کے قائداعظم کا ساتھ دیا اور زبردست جدوجہد کے بعد ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان حاصل کر کے دنیا کو یہ دکھا دیا کہ سرسید کے سپوت ناممکن کو بھی ممکن بنا سکتے ہیں۔ مولانا حسرت موہانی، مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی جوہر جیسے انقلابی لوگ اسی علی گڑھ

سے اٹھے اور پھر ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۷ء تک ہر سال قائداعظم کا علی گڑھ آنا اور علی گڑھ کو اسلامیان ہند کا دل ودماغ قرار دینا بھی بڑا اہم واقعہ ہے۔ قائداعظم محمد علی جناح نے جس دن سے ملک کی سیاست میں قدم رکھا تھا اسی دن سے ان کے دل میں سرسید احمد خاں اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی عظمت قائم ہو گئی تھی۔ سرسید اور قائداعظم دونوں نے ہی مسلم قوم کی بقاء کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر دی تھیں۔ جس کام کی ابتداء سرسید نے کی تھی اس کام کی تکمیل قائداعظم نے کی۔ اپنے عزم و حوصلہ و بے تعصبی کے لحاظ سے دونوں رہنماؤں میں بڑی مماثلت تھی۔ سرسید کے قائم کردہ دو قومی نظریے کو قائداعظم نے آگے بڑھایا اور پاکستان بنا کر دکھا دیا۔ تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ اگر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا وجود نہ ہوتا تو پاکستان ہرگز نہیں بن سکتا تھا۔ گویا کہ پاکستان بھی مسلم قوم کے لئے سرسید ہی کا تحفہ ہے۔ علی گڑھ کے طلبہ پاکستان کی تحریک میں ہمیشہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے، اور قائداعظم کے ہر حکم پر سر جھکا دیتے تھے۔ اسی لئے قائداعظم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو "مسلم ہند کا اسلحہ خانہ" کہتے تھے۔ ایک موقع پر قائداعظم نے یہ بھی کہا تھا کہ "علی گڑھ جو کچھ آج سوچ رہا ہے وہ مسلم قوم کل سوچے گی۔" قائداعظم بار بار علی گڑھ کا دورہ کرتے تھے اور ہر موقع پر علی گڑھ کے لڑکے قائداعظم کے حلقہ بگوش نظر آتے تھے۔ قائداعظم کو جب بھی کوئی اہم اعلان کرنا ہوتا تھا تو وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پلیٹ فارم سے ہی کرتے تھے۔ وہ آخر دم تک علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کورٹ ممبر بھی رہے اور ان کی تصویر آج بھی وہاں کے یونین ہال میں آویزاں ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے پاکستان کی تخلیق میں قائداعظم کی قیادت میں اتنا زبردست حصہ لیا تھا کہ قیام پاکستان کے بعد بھی آج تک پاکستان کی باگ ڈور زیادہ تر انہی لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے فارغ التحصیل ہیں۔ مثلاً اب تک چھ سربراہان مملکت پاکستان علی گڑھ ہی کے تعلیم یافتہ تھے۔ متعدد وزراء، گورنرز، اسمبلی ممبران اور مسلم لیگ کے صدر صاحبان وغیرہ زیادہ تر علیگیرین ہی تھے۔ دراصل علی گڑھ تحریک اور تحریک پاکستان دونوں ایک ہی تھیں۔ سر آغا خاں نے علی گڑھ تحریک اور تحریک

پاکستان کے باہمی تعلق کو ظاہر کرنے کے لئے نہایت جامع اور مختصر الفاظ میں یہ کہا تھا کہ "آزاد خود مختار پاکستانی قوم کی ولادت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ہوئی تھی" قائداعظم اور سر آغاخان نے مل کر اس درسگاہ کی مالی امداد بھی کی تھی اور چندہ جمع کرنے میں بھی بڑی گرم جوشی دکھائی تھی۔ ان دونوں رہنماؤں نے اور بھی کئی خطرناک موقعوں پر علی گڑھ تحریک کی حمایت کی تھی۔ علی گڑھ کے طلبا اور قائداعظم کے درمیان محبت کا جو رشتہ تھا اس کا ادنیٰ سامنے مظہر یہ تھا کہ جنوری ۱۹۳۸ء میں قائداعظم کی بگھی کو گھوڑوں کے بجائے علی گڑھ کے طلبہ نے ریلوے اسٹیشن سے یونیورسٹی کیمپس تک خود کھینچا تھا اور نعرے لگاتے ہوئے ایک زبردست جلوس کی شکل میں ان کو لے کر گئے تھے۔ ستمبر ۱۹۴۱ء میں علی گڑھ ہی کے یونین ہال میں تقریر کرتے ہوئے قائداعظم نے وہ نعرہ لگایا تھا جو آج پاکستان کا نصب العین بن گیا ہے یعنی "اتحاد، یقین اور تنظیم" اسی یونین ہال میں قائداعظم نے کانگریس کے نعرے "انڈیا چھوڑ دو" کے جواب میں "تقسیم کرو اور جاؤ" کا نعرہ لگایا تھا۔

پاکستان کے قیام سے کچھ ہی پہلے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اسٹریچی ہال میں قائداعظم نے اپنی یادگار تقریر میں کہا تھا "پاکستان ہمارا نصب العین، ہمارا دماغ اور ہمارا مقدر ہے۔ ہم اس سے انکار کرتے ہیں کہ ہم ہندوؤں اور دوسروں کے ساتھ مل کر ایک قوم ہیں۔ ہم میں کوئی قدر مشترک نہیں ہے سوائے خود ساختہ جغرافیائی حدود کے اور عارضی غلامی کے بندھن کے۔ جو متحدہ قومیت ان چیزوں پر منحصر ہوگی وہ غیر فطری ہوگی جو نہ قائم رہ سکتی ہے نہ قائم رہے گی۔ ہم خود باعزت لوگ ہیں اور دوسروں کے حقوق کی بھی اسی طرح عزت کرتے ہیں۔ ہم رہنا بھی چاہتے ہیں اور رہنے دینا بھی چاہتے ہیں۔ کسی کو پاکستان سے خوف زدہ نہیں ہونا چاہئے۔" جب قائداعظم کی یہ تقریر اسٹریچی ہال میں گونج رہی تھی تو تمام سامعین ہمہ تن گوش تھے اور محسوس ہو رہا تھا کہ عالم بالا سے سرسید کی روح سنتے ہوئے بھی مسرور ہو رہی ہے۔ ایک دفعہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے یونین ہال میں تقریر کرتے ہوئے قائداعظم نے کہا تھا کہ "پاکستان ہمارا لاواحد دعویٰ ہے، تاریخ اس کا تصفیہ کر رہی ہے، انصاف

اس کا تقاضا کر رہا ہے، اعداد اسے بتا رہے ہیں، تقدیر اس کا مطالبہ کر رہی ہے، مستقبل اس کا انتظار کر رہا ہے، اور ان شاء اللہ ہم اسے حاصل کریں گے۔"

جب پاکستان بالکل سامنے نظر آنے لگا تو قائد اعظم نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر ضیاء الدین احمد کی مدد سے علی گڑھ کے فارغ التحصیل لڑکوں کو سول سروس اور فوجی عہدوں پر جوق در جوق پہنچایا، اور جب پاکستان قائم ہو گیا تو علی گڑھ کے انہی طلبہ نے پاکستان کو ہر شعبے میں سنبھالا جبکہ ہندوؤں کی کوشش یہ تھی کہ پاکستان اپنے قیام کے فوراً بعد ہی ختم ہو جائے۔ قیام پاکستان سے پہلے ۴۶-۱۹۴۵ء کا زمانہ مسلم قوم کے لئے بڑا نازک تھا جبکہ جنرل الیکشن ہو رہے تھے اور پاکستان کی قسمت کا فیصلہ کیا جا رہا تھا اس کٹھن گھڑی میں بھی علی گڑھ کے طلبہ ہی نے مسلمان قوم کی لاج رکھی اور الیکشن کے کام میں تن من دھن سے لگ گئے۔ یہ الیکشن مسلم لیگ کی طاقت آزمانے کے لئے کرائے جا رہے تھے اس لئے بڑے اہم تھے۔ ۲ نومبر ۱۹۴۵ء کو قائد اعظم نے نوابزادہ لیاقت علی خان کے ذریعے سے علی گڑھ کے طلبہ کو اپنا خاص پیغام بھجوایا کہ "اپنے بہتر مستقبل کے لئے اپنے ایک تعلیمی سال کی قربانی دو" بس پھر کیا تھا قائد اعظم کے اس حکم پر علی گڑھ کے نوجوان ہندوستان کے چپے چپے پر پھیل گئے اور دن رات الیکشن کے کاموں میں جٹ گئے۔ ہر طرف گروہ در گروہ جا کر مسلمان مردوں اور عورتوں میں سیاسی بیداری پیدا کی اور ان سے مسلم لیگ کے حق میں ووٹ ڈلوائے۔ علی گڑھ گرلز کالج کی لڑکیوں نے بھی مسلمان عورتوں میں جوش اور ولولہ پیدا کیا، اور ان کو اپنے ساتھ لے جا کر ووٹ ڈلوائے نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم لیگ کو پورے ہندوستان میں مثالی کامیابی حاصل ہوئی اور پاکستان کا حصول یقینی ہو گیا۔ صوبہ سرحد اور سلہٹ کے ریفرنڈموں میں بھی علی گڑھ کے طلبہ ہی کی وجہ سے کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ راقم الحروف نے بھی علی گڑھ شہر میں دیگر طلبہ و طالبات کے ساتھ مل کر کانگریس کے امیدوار مسٹر انصاری کے خلاف پروفیسر اے بی اے حلیم کے الیکشن میں دن رات ایک کر دیا تھا جس کے نتیجہ میں پروفیسر اے بی اے حلیم کو مثالی کامیابی حاصل ہوئی تھی اور مسٹر

انصاری کی ضمانت بھی ضبط ہو گئی تھی۔ پروفیسر "اب ا" حلیم اس زمانے میں علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے پرووائس چانسلر تھے۔ میں اس زمانہ میں انجینئرنگ کالج کا طالب علم تھا۔ شاندار کامیابی کے بعد فتح کا عظیم الشان جلوس نکالا گیا جس نے پورے علی گڑھ شہر میں گشت کیا تھا اور کانگریس کے خلاف نعرے لگائے تھے۔

ان الیکشنوں نے ثابت کر دیا تھا کہ مسلم لیگ ہی ہندوستان کے مسلمانوں کی واحد نمائندہ سیاسی جماعت ہے۔ چنانچہ مسلم لیگ کا مطالبہ مان لیا گیا اور پاکستان عالم وجود میں آگیا۔ اب خدا کے فضل سے سرسید کے دو قومی نظریئے کی بنیاد پر قائداعظم کی انتھک کوششوں سے پاکستان بن چکا ہے اور نصف صدی بیت چکی ہے، مگر اب جو ہم آنکھ کھول کر دیکھتے ہیں تو اب تک جتنی ترقی ہمیں کرنی چاہئے تھی اتنی ترقی نہیں ہوئی، بلکہ قومی یکجہتی کے اعتبار سے ہم نے ترقی معکوس کی ہے۔ جس جذبے سے ہم نے یہ ملک بنایا تھا وہ جذبہ ختم ہوتا جا رہا ہے اور وہی صوبائیت و فرقہ واریت پھر سے سر اٹھا رہی ہے جس کا سر علی گڑھ تحریک نے بالکل کچل دیا تھا۔ ہمیں اپنا محاسبہ کرتے رہنا چاہئے اور ماضی کو یاد رکھ کر مستقبل کی تعمیر کرنی چاہئے۔ سرسید اپنی مسلم قوم کو جس بام عروج پر پہنچانا چاہتے تھے وہ مقصد ابھی حاصل نہیں ہوا ہے۔ ابھی ہمارے اخلاق کو مزید "تہذیب" کی ضرورت ہے تاکہ ہمارے اندر ایثار و قربانی کا جذبہ پیدا ہو سکے۔ جب ہم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تھے تو پاکستان بننے سے بھی پہلے ہم اس ماحول کو ایک چھوٹا سا پاکستان سمجھتے تھے بلکہ ہمارے دشمن بھی یہی کہتے تھے کہ "علیگڑھ مسلم یونیورسٹی تو ابھی سے ایک چھوٹا سا پاکستان بن گئی ہے" اس وقت ہمارے دماغوں میں یہی معصوم سا تصور تھا کہ جس طرح آج علیگڑھ مسلم یونیورسٹی "ایک چھوٹا سا پاکستان" ہے اسی طرح جب پاکستان بن جائے گا تو وہ "بڑی سی علیگڑھ مسلم یونیورسٹی" ہو گا۔ کاش ہمارا یہ تصور صحیح نکلتا۔ کاش اب بھی کوئی معجزہ ہو جائے کہ ہمارا یہ تصور صحیح نکلے۔ کاش اب بھی سرسید کی روح ہماری رہنمائی کرے اور ہم صوبائیت، فرقہ واریت، منافقت، اور لاقانونیت کا سر کچل کر رکھ دیں۔

اقامتی کالج کے متعلق سرسید کے تصورات

سرسید نے جب علی گڑھ میں محمڈن اینگلو اورینٹل اسکول اور پھر کالج قائم کرنے کا ارادہ کیا تو پہلے اس کا ایک عملی خاکہ تیار کر کے اسے رسالہ تہذیب الاخلاق مورخہ ۴ ستمبر ۱۸۷۲ء میں ایک مضمون کی شکل میں شائع کیا تھا۔ یہی مضمون بعد میں علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۵ اپریل ۱۹۱۱ء میں بھی شائع ہوا تھا۔ اس طویل مضمون میں سرسید نے مجوزہ اقامتی علی گڑھ کالج کے متعلق اپنے جو تصورات پیش کئے تھے انکے خاص خاص پہلو مندرجہ ذیل ہیں:۔

"مدرسۃ العلوم کو ایک ایسی اسلامی یونیورسٹی کی شکل میں تبدیل کیا جائے گا جیسی یونیورسٹیاں آکسفورڈ اور کیمبرج میں ہیں۔ جس طرح آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹیوں میں چرچ ہیں اسی طرح یہاں بھی مسجدیں قائم کی جائیں گی۔ ان مسجدوں میں پانچوں وقتوں کی نمازوں میں شریک ہونا مسلم طلبہ پر فرض ہوگا۔ غیر اقامتی طلبہ ظہر اور عصر کی نمازوں میں شریک ہوں گے۔ بورڈنگ ہاؤس میں ایسے مکمل کمرے ہوں گے جن میں غسل کرنے کیلئے، مطالعہ کرنے کے لئے، اٹھنے بیٹھنے کے لئے اور سونے کے لئے کافی گنجائشیں ہوں گی۔ بورڈنگ ہاؤس میں ایک بڑا ہال ہوگا جہاں طلبہ جمع ہو سکیں گے اور ایک ڈائننگ ہال ہوگا جہاں طلبہ اجتماعی طور پر کھانا کھا سکیں گے۔ کھیل کا میدان اور سوئمنگ پول بھی ہوگا۔ ایک شفاخانہ بھی ہوگا جہاں ایک ایلوپیتھک ڈاکٹر اور ایک یونانی حکیم ہوگا۔ کالج کے طلبہ کے لئے لازمی یونیفارم ہوگی جس میں کالے الپکہ کا لمبہ آستین چغہ اور لال ترکی ٹوپی ہوگی۔ مغربی طرز کے جوتے اور موزے بھی پہننے ہوں گے۔ کالج میں دھوتی پہننا ممنوع ہوگا۔ ناشتہ کرنے، دوپہر کا اور رات کا کھانا کھانے، غسل کرنے، لباس تبدیل کرنے، سونے کے لئے بستروں پر جانے، دیگر ضروری کاموں کے لئے اوقات مقرر ہوں گے جن کی سختی سے پابندی کی جائے گی۔ کھیلنے کے لئے متعدد قسم کے کھیل کے سامان موجود ہوں گے اور جو کھیل جس کو پسند ہو گا وہ

اختیار کرے گا۔ جھوٹ بولنا گو وہ کیسی ہی خفیف بات میں کیوں نہ ہو ایک بہت بڑا جرم سوسائٹی کا سمجھا جائے گا۔ الفاظ بد جو لڑکوں کی زبان پر چڑھ جاتے ہیں ان [illegible] امتناع ہوگا۔ یہاں تک کہ اگر کوئی لڑکا کسی کو جھوٹا کہہ بیٹھے گا تو وہ [illegible] سمجھا جائے گا۔ طلبہ کو کافی مقدار میں اپنے کپڑے رکھنے ہوں گے تا [illegible] رہ سکیں۔ کسی لڑکے کو اجازت نہ ہوگی کہ وہ [illegible] ہوا یا بازار کا رنگا ہوا رنگین و نیم رنگ، یا ایسا باریک جس میں سے بدن [illegible] یا ایسا تنگ جس سے سینہ کا ابھار اور پیٹ نظر آئے کپڑا پہنے۔ بیڑی سگریٹ حقہ پینا اور پان کھانا سختی سے ممنوع ہوگا۔ غیر اقامتی طلبہ کے لئے چھوٹے کمرے موجود ہوں گے جہاں وہ اپنے کپڑے تبدیل کر کے یونیفارم پہن سکیں۔ اس بات کی مکمل طور پر روک تھام کی جائے گی کہ شیعہ اور سنی لڑکے اپنے مذہبی اختلافات پر کالج میں یا بورڈنگ ہاؤس میں بحث و مباحثہ نہ کریں۔ یہ سب باتیں ابھی تو مثل ایک خواب کے ہیں۔ یا تو خدا نہ خواستہ وہی مثل ہوگی کہ اٹھتے ہی آنکھ کھل گئی، یا ان شاء اللہ تعالیٰ بعینہ اس کا ظہور ہو اور ٹھیک تعبیر ہوئی۔ ہم کو خدا سے امید ہے کہ ٹھیک تعبیر ہوگی۔"

سرسید کے مندرجہ بالا تصورات کتنے اعلیٰ وارفع و اکمل تھے اور ان میں کس قدر خلوص نیت شامل تھا کہ سرسید کے اس خواب کی تعبیر ٹھیک ہی ہوئی اور وہ خواب بہت جلد ایک زندہ حقیقت کی شکل میں رونما ہو گیا۔ یعنی ۱۸۷۵ء میں علیگڑھ میں محمڈن اینگلو اورینٹل اسکول کھل گیا اور پھر ۱۸۷۷ء میں یہی اسکول کالج بن گیا اور اس محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میں وہی اصول و قواعد و ضوابط جاری کر دیئے گئے جن کے تصورات سرسید نے پہلے ہی سے قائم کر رکھے تھے۔ سرسید کی دلی تمنا کے مطابق اس علی گڑھ کالج میں مسلم قوم کے بچے تعلیمی ماحول میں پروان چڑھنے لگے اور وہاں محبت و شفقت کی ایسی مثالی فضا قائم ہو گئی جس کی شہرت پورے ملک میں پھیل گئی۔ اپنے حسین خواب کی اس پر نور تعبیر کا ذکر سرسید نے ۱۸۸۳ء میں پٹنہ کے مقام پر اپنی ایک تقریر میں اس طرح کیا تھا "آؤ ہمارے ساتھ علیگڑھ چلو، اور ہمارے کالج کے ان پیارے عزیز بچوں کو دیکھو جو بطور بورڈر کے وہاں رہتے ہیں، جن

ئی صورت دیکھ کر ہمارے دل میں پیار آتا ہے، جن کے خیال سے ہماری روح خوش ہوتی ہے، اور ان کو جو محبت ہمارے ساتھ ہے اس کا تماشا دیکھو۔باپ سے زیادہ ہم سے محبت رکھتے ہیں۔ ہماری خفگی سے کوئی چیز ان کو زیادہ رنج دینے والی نہیں ہوتی۔ ہماری جھڑکی، ہمارا طمانچہ، ہمارے ہاتھ کی سختی سے ان کو عبرت اور نصیحت ہوتی ہے مگر وہ اس کو ایسی ہی عزت سے قبول کرتے ہیں جیسے بیٹا اپنے باپ کی تادیب وتنبیہ کو۔"

سرسید کے انتقال کے بائیس سال بعد ۱۹۲۰ء میں وہی کالج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تبدیل ہو گیا اور اس یونیورسٹی میں بھی وہی روایات قائم ہو گئیں جو سرسید کے زمانے سے چلی آرہی تھیں اور وہی روایات کم وبیش اب بھی قائم ہیں۔ وہاں امیر و غریب، شیعہ و سنی، طلبہ واساتذہ سب شیر و شکر ہو کر رہتے ہیں اور تعلیم کے اعلیٰ معیار کو گرنے نہیں دیتے۔ لڑکوں کا کالج قائم ہونے کے بعد سرسید کی خواہش کے مطابق لڑکیوں کا گرلز کالج بھی قائم ہو گیا جہاں مسلم قوم کی بیٹیاں بھی یکساں طور پر تعلیم وتربیت حاصل کرتی ہیں۔ علیگڑھ کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ نواب سلطان جہاں بیگم آف بھوپال کو اس یونیورسٹی کا سب سے پہلا چانسلر بنایا گیا اور مہاراجہ محمد علی محمد خان آف محمود آباد کو سب سے پہلا وائس چانسلر بنایا گیا۔ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کا یہ سلسلہ آگے بڑھ کر سرسید یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی کراچی سے آکر مل گیا ہے جو ۱۹۹۳ء میں قائم ہوئی اور جس کا سب سے پہلا چانسلر جناب ظل احمد نظامی کو بنایا گیا اور سب سے پہلا وائس چانسلر ڈاکٹر عبدالتواب خان کو بنایا گیا۔ علیگڑھ کی یہ خوش قسمتی ہے کہ اسے اتنے اعلیٰ پائے کے مربیان واساتذہ نصیب ہوئے جن کی مثال ملنا مشکل ہے۔ مثلاً پروفیسر آرنلڈ، مسٹر بیک، مسٹر موریسن، سید محمود، سر شاہ سلیمان، سر راس مسعود، سر آغا خاں، جسٹس امیر علی، مولوی سمیع اللہ، ڈاکٹر ضیاء الدین احمد، ڈاکٹر ہادی حسن، ڈاکٹر طاہر رضوی، ڈاکٹر بابر مرزا، ڈاکٹر حیدر خان، ڈاکٹر اسحٰق، ڈاکٹر بٹ، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں، پروفیسر ابوبکر احمد حلیم، پروفیسر فیلڈن، پروفیسر ہیتھیمین، پروفیسر ارجھ ناث، پروفیسر حبیب، پروفیسر رشید احمد صدیقی، پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر شیخ

عبدالرشید، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، خان بہادر شیخ محمد عبداللہ، میر ولایت حسین، ڈپٹی حبیب اللہ خاں، نواب سر مزمل اللہ خان، مولانا شبلی نعمانی، مولانا عبدالعزیز میمن، مولانا شبر، مولانا تقی وغیرہ وغیرہ یہ ایسی ہستیاں ہیں جو علیگڑھ کے فارغ التحصیل طلبہ وطالبات کے دلوں پر آج بھی راج کر رہی ہیں۔ اسی طرح خود علیگڑھ کے سپوتوں میں بھی ایسی ایسی عظیم ہستیاں ایک بہت بڑی تعداد میں ساری دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں جنکے کارنامے رہتی دنیا تک یاد رہیں گے۔ صرف پاکستان ہی میں ہزاروں فرزندان علیگڑھ اپنی روشنیٔ طبع سے پورے ملک کو پر نور بنائے ہوئے ہیں۔ ماہنامہ تہذیب کراچی بابت اکتوبر ۱۹۹۲ء میں جناب عقیل احمد نظامی کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے "پاکستان میں علیگڑھ کے مشاہیر"۔ اس مضمون میں نظامی صاحب نے تقریباً سوا سو مشہور پاکستانی علیگ بھائیوں کے حالات زندگی تفصیل کے ساتھ درج کئے ہیں جن کو پڑھ کر سرسید کے خواب کی روشن تعبیر کا کچھ اندازہ ہو سکے گا۔

☆

سرسید یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی کراچی کا قیام

ایسے پر آشوب زمانہ میں یعنی اکتوبر ۱۹۹۳ء میں جبکہ پاکستان میں زبردست سیاسی، اقتصادی اور تعلیمی بحران چھایا ہوا تھا اور ملک کا نظم و نسق ایک عبوری حکومت چلا رہی تھی، کراچی میں سرسید یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی کا قیام ایک عجوبہ معلوم ہوتا ہے۔ در اصل یہ سب کچھ اسی علیگڑھ اسپرٹ کا معجزہ ہے۔ جس کا مظاہرہ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن آف پاکستان (کراچی) نے بھرپور انداز میں کیا ہے۔ اس ایسوسی ایشن کے ارکان نے کراچی میں ۱۹۸۹ء میں علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی قائم کیا تھا، پھر ۱۹۹۳ء میں سرسید یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی قائم کی، اور پھر ۱۹۹۵ء میں نسیم القدر میموریل علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی فار گرلز قائم کیا۔ یہ تینوں ادارے خدا کے فضل سے بڑی کامیابی کیساتھ ترقی کر رہے ہیں اور مسلمان قوم کی خدمت کر رہے ہیں۔ ان اداروں کا تفصیلی تذکرہ اس مقام پر کرنا زیادہ مناسب معلوم نہیں ہوتا کیونکہ ہمارا مقصد صرف سرسید کی علیگڑھ تحریک کا مختصر تعارف پیش کرنا ہے، لیکن پھر بھی اتنا کہنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سرسید یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی کراچی کا قیام باقاعدہ طور پر تمام قانونی کارروائیوں کے تحت عمل میں آیا ہے، یعنی پہلے سندھ گورنمنٹ آرڈیننس نمبر XII-۱۹۹۳ مورخہ ۱۶ اکتوبر ۱۹۹۳ء نکلا، پھر ۱۸ اکتوبر ۱۹۹۳ء کو اس یونیورسٹی کے چارٹر پر گورنر سندھ حکیم محمد سعید صاحب کے دستخط ہوئے، پھر اس یونیورسٹی کا ایکٹ سندھ اسمبلی نے ۱۷ ستمبر ۱۹۹۵ء کو پاس کر دیا جس کی منظوری گورنر سندھ نے ۱۱ اکتوبر ۱۹۹۵ء کو دی۔ اس کے بعد اسے سرکاری گزٹ میں شائع کر دیا گیا۔ اس کا قانونی نام ہے "سرسید یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی ایکٹ ۱۹۹۵ء سندھ ایکٹ X آف ۱۹۹۵ء۔"

سرسید یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی کراچی کے سب سے پہلے چانسلر جناب ظل احمد نظامی صاحب ہیں اور سب سے پہلے وائس چانسلر جناب ڈاکٹر اے ٹی خاں صاحب تھے جن کا انتقال پر ملال ۲۳ ستمبر ۱۹۹۶ء کو ہو گیا۔ ان کی جگہ ڈاکٹر سید نذیر احمد صاحب کو وائس چانسلر بنایا گیا ہے جو بین الاقوامی شہرت رکھتے ہیں۔ یہ نہایت مسرت کا مقام ہے کہ اس یونیورسٹی نے اتنے کم عرصہ میں اتنی حیرت انگیز ترقی کر لی ہے کہ حال ہی میں ۸ ستمبر ۱۹۹۶ء کو پاکستان انجینئرنگ کونسل کی "ہائی لیول ٹیم" نے جب اس یونیورسٹی کا معائنہ کیا تھا تو اس کونسل کے چیئرمین نے یونیورسٹی کی "وزیٹرز بک" میں جو تعریفی جملے لکھے تھے ان کا ترجمہ ذیل میں درج کیا جارہا ہے:۔

"میرے لئے یہ ایک اعزاز تھا کہ میں نے سرسید یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی کراچی کا معائنہ کیا۔ مجھے یہ دیکھ کر مسرت آمیز حیرت ہوئی کہ اتنے مختصر عرصہ میں اس یونیورسٹی نے انجینئرنگ کی تعلیم میں اتنی زیادہ ترقی کر لی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس کا سبب اس یونیورسٹی کے بانیان کا جوش اور ولولہ ہے۔ اس جذبہ کو قائم رکھئے۔ براہ کرم اس بات کو یقینی بنایئے کہ تعلیم اور تنظیم شروع سے آخر تک ساتھ ساتھ چلیں۔"

سرسید یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی کراچی کے پس منظر کے طور پر، سرسید کی قائم کردہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اس اجلاس کا تذکرہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہو گا جو ۱۹۰۷ء میں اسی کراچی میں منعقد ہوا تھا اور جس کی صدارت مولانا الطاف حسین حالی نے کی تھی۔ مولانا حالی نے اپنے خطبہ صدارت میں مسلمانوں کے لئے ٹیکنیکل ایجوکیشن کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے کہا تھا کہ "مسلمانوں کی قومی ترقی کے لئے محض یونیورسٹی کی موجودہ تعلیم کافی نہیں ہے، بلکہ ضرور ہے کہ وہ تعلیم کے ہر ایک شعبے میں دستگاہ حاصل کریں، اور اس دوڑ میں جس میں ان کے ہم وطن ان سے بہت آگے نکل گئے ہیں جہاں تک ممکن ہو شریک ہوں ورنہ وہ زمانہ بہت قریب ہے کہ ان کو نہ صرف اپنی عزت و توقیر بلکہ اپنی بقا اور ہستی سے بھی ہمیشہ کے لئے ہاتھ دھونا پڑے گا۔"

سرسید مرحوم کے خاص نمائندہ مولانا حالیؔ کے اس انتباہ کے چھیاسی سال بعد ہی اسی کراچی میں مسلمانوں کے لئے ایک مکمل ٹیکنیکل یونیورسٹی کا قیام سرسید اور مولانا حالیؔ دونوں ہی کی بصیرت کا جیتا جاگتا ثبوت ہے، خصوصاً اس وجہ سے بھی کہ اس یونیورسٹی کا نام بھی سرسید کے مبارک نام پر رکھا گیا ہے اور اس کا قیام بھی سرسید کے سپوتوں کے ہاتھوں عمل میں آیا ہے۔

☆

maablib.org

سرسید یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی کراچی کے بنیادی تصورات

علیگڑھ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن پاکستان کراچی نے ۱۹۹۳ء میں سرسید یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی کراچی قائم کی تھی اور اسی وقت سے اس یونیورسٹی کے مندرجہ ذیل چودہ بنیادی تصورات مقرر کردیے گئے تھے جن پر اب تک سختی سے عمل کیا جاتا رہا ہے جس کی وجہ سے یہ یونیورسٹی روز افزوں ترقی کررہی ہے۔ خدا اس کی ترقیوں کو اسی طرح جاری رکھے۔ آمین ثم آمین۔

(۱) مرکز نفاست وفضیلت

(۲) جذبہ علیگڑھ

(۳) اعلیٰ پایہ کی تعلیم اور کردار سازی

(۴) نظم وضبط اور معاملات طلبہ

(۵) پابندیٔ اوقات

(۶) تجربہ گاہ کا اعلیٰ ترین استعمال

(۷) کتب خانہ کا اعلیٰ ترین استعمال

(۸) ضروریات لباس

(۹) نظام تعلیم

(۱۰) پیشگی تحریری مواد برائے طلبہ

(۱۱) مراتب اساتذہ

(۱۲) کھیلوں کی ترقی

(۱۳) تقریری انجمنیں

(۱۴) عملی مستقبل کی منصوبہ بندی

☆

ترانۂ علیگڑھ

علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے ایک مایۂ ناز فرزند اسرارالحق مجاز نے ۱۹۳۶ء میں علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کی رومانی فضاؤں سے متاثر ہو کر انیس اشعار کی ایک نظم کہی تھی، جس کا عنوان تھا "نذر علیگڑھ"۔ تقسیم ہند کے بعد ۱۹۵۴ء میں اسرارالحق مجاز نے اپنی اسی نظم کے دس اشعار منتخب کر کے "ترانۂ علیگڑھ" کی تخلیق کی تھی۔ اس ترانۂ علیگڑھ کو علیگڑھ کے ایک اور سپوت اشتیاق محمد خاں نے ایک نرالی دھن دے کر نہایت پرکشش بنادیا تھا۔ اس ترانے کو سب سے پہلے علیگڑھ مسلم یونیورسٹی میں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں وائس چانسلر کے دور میں ۱۷ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو جشن سرسید کے موقع پر پیش کیا گیا تھا جسے یونیورسٹی کے طلبہ و طالبات نے مل کر کورس کی شکل میں سازوں کی دلکش آوازوں کے ساتھ گایا تھا۔ اب علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے ہر بڑے فنکشن میں یہ ترانۂ علیگڑھ اسی مخصوص دھن میں گایا جاتا ہے جس سے سامعین پر عجیب وجد کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ پاکستان میں یہ ترانۂ علیگڑھ سب سے پہلے علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی کراچی کے طلبہ و طالبات نے ۱۷ اکتوبر ۱۹۹۲ء کو جشن سرسید کے موقع پر وہاں کے ایڈمنسٹریٹر جناب آغا سالار احمد شاہ کی رہنمائی میں پیش کیا تھا اور راقم الحروف نے اس کا انتظام کیا تھا۔

یہ میرا چمن ہے میرا چمن، میں اپنے چمن کا بلبل ہوں
سرشار نگاہ نرگس ہوں، پابستۂ گیسوئے سنبل ہوں

جو طاق حرم میں روشن ہے وہ شمع یہاں بھی جلتی ہے
اس دشت کے گوشے گوشے سے اک جوئے حیات ابلتی ہے
یہ دشت جنوں دیوانوں کا، یہ بزم وفا پروانوں کی
یہ شہر طرب رومانوں کا، یہ خلد بریں ارمانوں کی

فطرت نے سکھائی ہے ہم کو، افتاد یہاں پرواز یہاں
گائے ہیں وفا کے گیت یہاں، چھیڑا ہے جنوں کا ساز یہاں

یہ میرا چمن ہے میرا چمن، میں اپنے چمن کا بلبل ہوں
یہ میرا چمن ہے میرا چمن میں اپنے چمن کا بلبل ہوں

اس بزم میں تیغیں کھینچی ہیں، اس بزم میں ساغر توڑے ہیں
اس بزم میں آنکھ بچھائی ہے، اس بزم میں دل تک جوڑے ہیں
ہر شام ہے شام مصر یہاں، ہر شب ہے شب شیراز یہاں
ہے سارے جہاں کا سوز یہاں، اور سارے جہاں کا ساز یہاں
ذرات کا بوسہ لینے کو، سو بار جھکا آکاش یہاں
خود آنکھ سے ہم نے دیکھی ہے، باطل کی شکست فاش یہاں

یہ میرا چمن ہے میرا چمن، میں اپنے چمن کا بلبل ہوں
سرشار نگاہ نرگس ہوں، پابستہ گیسوئے سنبل ہوں

جو ابر یہاں سے اٹھے گا
وہ سارے جہاں پر برسے گا
ہر جوئے رواں پر برسے گا
ہر کوہ گراں پر برسے گا
ہر سرو و سمن پر برسے گا
ہر دشت و دمن پر برسے گا

خود اپنے چمن پہ برسے گا
غیروں کے چمن پہ برسے گا
ہر شہر طرب پہ گرجے گا
ہر قصر طرب پہ کڑکے گا
یہ ابر ہمیشہ برسا ہے
یہ ابر ہمیشہ برسے گا

"تحفۂ سرسید" (نظم)

دسمبر ۱۹۹۲ء میں حکومت پاکستان نے ایک اسکیم کے تحت پرائیویٹ سیکٹر کو مشروط طور پر مختلف قسم کی یونیورسٹیاں کھولنے کی اجازت دی تھی جس کے مطابق کراچی میں چار مختلف یونیورسٹیوں کو چارٹر عطا کیا گیا جن میں سرسید یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی بھی تھی جسے علیگڑھ مسلم یونیورسٹی اولڈبوائز ایسوسی ایشن پاکستان کراچی نے قائم کیا تھا اور جس کے چارٹر پر ۸ اکتوبر ۱۹۹۳ء جمعہ کو سندھ کے گورنر حکیم محمد سعید نے دستخط کئے تھے۔ اس زمانے میں سندھ میں ڈاکٹر این اے بلوچ وزیر تعلیم اور حکیم محمد احسن وزیر صحت تھے۔ اس سے پہلے ۱۹۸۹ء میں علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی کراچی کو بھی علیگڑھ مسلم یونیورسٹی اولڈبوائز ایسوسی ایشن پاکستان کراچی نے ہی قائم کیا تھا۔ اور اسی اے آئی ٹی کراچی کی فائننشل اور ٹیکنیکل معاونت سے سرسید یونیورسٹی کا چارٹر حاصل کرنے میں کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ خود راقم الحروف نے بھی الیکٹرونکس انجینئرنگ کا مکمل سلیبس اور سیٹ اپ تیار کر کے پیش کیا تھا۔ ۱۷ اکتوبر ۱۹۹۳ء کو علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی کراچی کے کیمپس میں سرسید ڈے منایا گیا اور نماز مغرب کے بعد تمام حاضرین نے سرسید یونیورسٹی کا چارٹر حاصل ہو جانے پر نماز شکرانہ ادا کی۔ اس موقع پر راقم الحروف سید صمد حسین رضوی (علیگ) نے ایک نظم "تحفۂ سرسید" کہی تھی وہ ذیل میں درج ہے۔

علیگوں کی یہی تنظیم سرسید کا تحفہ ہے
یہ "تہذیب" اور یہ "تعلیم" سرسید کا تحفہ ہے
مسلمانوں کو چپہ بھر بھی دھرتی مل نہ سکتی تھی
یہ پورے ہند کی تقسیم سرسید کا تحفہ ہے
یہ قومی غیرت و ملی شعور و ذہنی آزادی
یہ اپنے دین کی تفہیم سرسید کا تحفہ ہے

ہزاروں مشکلیں ہیں پھر بھی ہم ہیں سربلند اب تک
یہ عزت اور یہ تعظیم سرسید کا تحفہ ہے
ابھی تک فیضِ سرسید ہے جاری قومِ مسلم پر
یہ یونیورسٹی "اسکیم" سرسید کا تحفہ ہے
یہ یونیورسٹی شاہد ہے اس زندہ حقیقت کی
کہ ڈیولپمینٹ کی یہ "تھیم" سرسید کا تحفہ ہے
اگرچہ اب بھی بے لوثی کا جذبہ ہم میں کچھ کم ہے
مگر پھر بھی ہماری "ٹیم" سرسید کا تحفہ ہے

☆

maablib.org

"علیگڑھ مسلم یونیورسٹی سے بچھڑتے وقت"

(سانیٹ)

راقم الحروف سید صمد حسین رضوی (علیگ) نے ۱۹۴۸ء میں علیگڑھ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ سے الیکٹریکل انجینئرنگ (الیکٹرونکس) کی ڈگری کا امتحان فرسٹ ڈویژن فرسٹ پوزیشن میں پاس کیا تھا اور پانچ مضامین میں ڈسٹنکشن حاصل کی تھی اور اسی سال علیگڑھ سے پاکستان روانگی ہوئی تھی۔ روانگی سے قبل میں نے مندرجہ ذیل سانیٹ کہا تھا۔

میں آہ! آج تجھے خیرباد کہتا ہوں
کبھی نہ بھولوں گا آغوش جانفزا تیری
یہ در، یہ ہال، یہ بیدار کن صدا تیری
عمارتوں کو تری حسرتوں سے تکتا ہوں
میں آنے والے بگولوں کی رو سے ڈرتا ہوں
بدل گئی ہے اسی سال سے فضا تیری
میں اپنے ساتھ بہاریں بھی لے چلا تیری
تجھے خزاں کے تھپیڑوں میں چھوڑے جاتا ہوں

برس رہا ہے فضاؤں سے خون انسانی
زمیں پہ زلزلۂ انقلاب برپا ہے
چھلکنے والے ہیں بوسیدہ طاقتوں کے ایاغ
ترے خمیر میں لیکن ہے جوش لافانی
خود انقلاب نے گودوں میں تجھ کو پالا ہے
ان آندھیوں میں بھی روشن رہے گا تیرا چراغ

سرسید احمد خاں کا شجرۂ نسب

(حیات جاوید کے حوالے سے)

(۱) محمد ﷺ (۲) فاطمہ زہرا زوجہ حضرت علی ابن ابیطالب (۳) امام حسین (۴) امام زین العابدین (۵) امام محمد باقر (۶) امام جعفر صادق (۷) امام موسیٰ کاظم (۸) امام موسیٰ رضا (۹) امام محمد تقی (۱۰) سید موسیٰ مبرقع (۱۱) سید ابی عبداللہ احمد (۱۲) سید محمد اعرج (۱۳) سید محمد احمد (۱۴) سید احمد (۱۵) سید موسیٰ (۱۶) سید احمد (۱۷) سید محمد (۱۸) سید علی (۱۹) سید جعفر (۲۰) سید محمد (۲۱) سید عیسیٰ (۲۲) سید ابوالفتح (۲۳) سید علی (۲۴) سید یار حسین (۲۵) سید کاظم الدین حسین (۲۶) سید جعفر (۲۷) سید باقر (۲۸) سید موسیٰ (۲۹) سید شرف الدین حسین (۳۰) سید ابراہیم (۳۱) سید حافظ احمد (۳۲) سید عزیز (۳۳) سید محمد دوست (۳۴) سید محمد برہان (۳۵) سید محمد عماد (۳۶) سید محمد ہادی (۳۷) سید محمد متقی (۳۸) سید احمد (بڑے بھائی سید محمد) (۳۹) سید محمود (بڑے بھائی سید حامد) (۴۰) سید راس مسعود (۴۱) سید اکبر مسعود (بڑے بھائی سید انور مسعود) (۴۲) سید احمد مسعود (چھوٹے بھائی سید محمود مسعود)

☆

maablib.org

راقم الحروف سید صمد حسین رضوی (علیگ) کا شجرۂ نسب

(باقیات عتیق کے حوالے سے)

(۱) محمد ﷺ (۲) فاطمہ زہرا زوجہ حضرت علی ابن ابیطالب (۳) امام حسین (۴) امام زین العابدین (۵) امام محمد باقر (۶) امام جعفر صادق (۷) امام موسیٰ کاظم (۸) امام موسیٰ رضا (۹) امام محمد تقی (۱۰) سید موسیٰ مبرقع (۱۱) سید ابی عبداللہ احمد (۱۲) سید محمد اعرج (۱۳) سید محمد احمد (۱۴) سید احمد (۱۵) سید موسیٰ (۱۶) سید احمد (۱۷) سید محمد (۱۸) سید علی (۱۹) سید جعفر (۲۰) سید محمد (۲۱) سید عیسیٰ (۲۲) سید ابوالفتح (۲۳) سید علی (۲۴) سید یار حسین (۲۵) سید کاظم الدین حسین (۲۶) سید جعفر (۲۷) سید باقر (۲۸) سید موسیٰ (۲۹) سید شرف الدین حسین (۳۰) سید ابراہیم (۳۱) سید حافظ احمد (۳۲) سید عزیز (۳۳) سید محمد دوست (۳۴) سید محمد حفیظ (۳۵) سید محمد کبیر (۳۶) سید تاج الدین (۳۷) سید اسد علی (۳۸) سید احمد حسین المتخلص بہ عتیق (چھوٹے بھائی سید محمود حسین) (۳۹) سید اسد حسین (چھوٹے بھائی سید صغیر حسین اور بڑے بھائی سید حامد حسین) (۴۰) سید صمد حسین (بڑے بھائی سید سعید حسین اور چھوٹے بھائی سید واحد حسین اور سید مسعود حسین) (۴۱) سید ارشد حسین (چھوٹے بھائی سید امجد حسین) (۴۲) سید محمد عباس (چھوٹے بھائی سید حیدر رضا اور سید امجد حسین کے فرزند سید محمد علی اکبر)

——— ☆ ———

واقعات سرسید

شمارات	تواریخ	حالات
۱	۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء	دہلی میں سرسید احمد خان کی ولادت ہوئی۔ جمعہ کا روز تھا اور ۵ ذی الحجہ ۱۲۳۲ھ کی تاریخ تھی۔ والد کا نام سید محمد متقی اور والدہ کا نام عزیز النساء بیگم تھا۔
۲	۹ فروری ۱۸۲۲ء	دہلی میں سرسید احمد خان کی رسم بسم اللہ ہوئی۔
۳	۱۸۲۸ء	دہلی میں سرسید کے نانا خواجہ فرید الدین کا انتقال ہوا۔
۴	۱۸۳۴ء	دہلی میں سرسید کی شادی پارسا بیگم سے ہوئی۔
۵	۱۸۳۶ء	دہلی میں سرسید کے بڑے بھائی سید محمد خاں نے ایک اخبار جاری کیا جس کا نام سید الاخبار تھا۔
۶	۱۸۳۸ء	دہلی میں سرسید کے والد سید محمد متقی رضوی دہلوی کا انتقال ہوا۔
۷	۱۸۳۸ء	سرسید نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت اختیار کی۔ شروع میں انھیں عارضی سررشتہ دار بنایا گیا۔
۸	فروری ۱۸۳۹ء	کمشنر آگرہ کے دفتر میں سرسید نائب منشی مقرر ہوئے۔
۹	۲۵ مئی ۱۸۳۹ء	سرسید نے فارسی کتاب "جام جم" تحریر کی جس میں شاہان مغلیہ کا تذکرہ تھا۔ یہ کتاب مئی ۱۸۴۰ء میں شائع ہوئی۔
۱۰	۱۸۴۱ء	سرسید نے منصفی کا امتحان پاس کیا۔ اسی سال انھوں

		نے اپنے بڑے بھائی کے اشتراک سے کتابچہ "انتخاب الاخوین" شائع کیا۔
۱۱	۲۴ دسمبر ۱۸۴۱ء	صوبہ یوپی کے شہر مین پوری میں منصف مقرر ہوئے۔
۱۲	۱۰ جنوری ۱۸۴۲ء	سرسید مین پوری سے تبدیل ہو کر فتح پور سیکری آگئے۔
۱۳	۱۸۴۲ء	سرسید نے نبی کریم کی شان میں ایک رسالہ تحریر کیا جس کا نام "جلاء القلوب بذکر المحبوب" رکھا گیا۔
۱۴	۱۸۴۲ء	سرسید کو مغلیہ دربار سے "جواد الدولہ عارف جنگ" کا خطاب عطا ہوا۔ جواد الدولہ کا خطاب سرسید کا موروثی خطاب تھا جو ان کے دادا سید محمد ہادی کو عطا ہوا تھا۔ عارف جنگ کے خطاب کا اضافہ بادشاہ نے خود کیا تھا۔
۱۵	۱۸۴۴ء	کرین کے اصول پر سرسید نے رسالہ "تسہیل فی جر ثقیل" لکھا۔ اسی سال ایک اور رسالہ بھی شائع کیا جس کا نام "تحفۂ حسن" تھا۔
۱۶	۲۴ دسمبر ۱۸۴۵ء	سرسید کے بڑے بھائی سید محمد خاں کا انتقال عین جوانی میں ہو گیا۔
۱۷	۱۸ فروری ۱۸۴۶ء	اپنی والدہ کی تنہائی دور کرنے کے لئے سرسید نے اپنا تبادلہ فتح پور سیکری سے دہلی کرا لیا اور والدہ کی خدمت میں لگ گئے۔ اسی سال انہوں نے اپنے نانا کے ایک رسالے کا ترجمہ کیا جس کا نام "فوائد الافکار فی اعمال الفرجار" رکھا گیا۔

۱۸	۱۸۴۷ء	سرسید نے اپنی شہرہ آفاق کتاب "آثار الصنادید" کا پہلا ایڈیشن شائع کیا۔ اس میں قدیم عمارتوں اور قدیم لوگوں کا ذکر ہے۔
۱۹	۱۸۴۸ء	سرسید نے ایک رسالہ "قول متین فی ابطال حرکت زمین" شائع کرایا جس میں زمین کے ساکن ہونے کا بیان ہے۔
۲۰	۱۵ فروری ۱۸۴۹ء	سرسید کے بڑے بیٹے سید حامد کی ولادت ہوئی۔ اسی سال سرسید نے اپنا رسالہ "کلمۃ الحق" مکمل کیا۔
۲۱	۱۸۵۰ء	رہتک شہر میں قائم مقام صدر امین مقرر ہوئے۔ انہوں نے بعد میں ۱۸۵۲ء میں بھی کچھ عرصہ یہاں کام کیا۔ اسی سال سرسید نے رسالہ "راہ سنت در رد بدعت" مکمل کیا۔ جو ۱۸۸۳ء میں شائع ہوا۔
۲۲	۲۴ مئی ۱۸۵۰ء	سرسید کے چھوٹے بیٹے سید محمود کی ولادت ہوئی۔
۲۳	۱۸۵۲ء	سرسید نے کتاب "سلسلۃ الملوک" تحریر کی جس میں قدیم بادشاہوں کا ذکر ہے۔ اسی سال کتاب "نمیقہ دربیان مسئلہ تصور شیخ" بھی تحریر کی جو ۱۸۸۳ء میں شائع ہوئی۔
۲۴	۱۸۵۳ء	سرسید نے امام غزالی کی کتاب "کیمیائے سعادت" کا جزوی ترجمہ کیا جس میں مسلمانوں کی ذہنی اصلاح کی گئی ہے۔
۲۵	۱۸۵۴ء	سرسید کی کتاب "آثار الصنادید" کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا۔

۲۶	۱۳ جنوری ۱۸۵۵ء	سرسید بجنور میں صدر امین مقرر ہوئے۔ اسی سال انہوں "تاریخ ضلع بجنور" لکھی۔
۲۷	۱۸۵۶ء	سرسید نے ابو الفضل کی کتاب "آئین اکبری" کی تصحیح کر کے اُسے شائع کرایا۔
۲۸	۱۰ مئی ۱۸۵۷ء	ہندوستان میں جنگ آزادی شروع ہوئی جسے اس وقت کے حکمران انگریزوں نے "غدر" کا نام دیا۔ ۱۲ مئی ۱۸۵۷ء تک یہ جنگ بجنور تک پھیل گئی جہاں سرسید صدر امین تھے۔
۲۹	۱۹ نومبر ۱۸۵۷ء	سرسید کی والدہ عزیز النساء بیگم کا انتقال میرٹھ میں ہو گیا۔
۳۰	اپریل ۱۸۵۸ء	سرسید مراد آباد میں صدر الصدور مقرر ہوئے۔ اسی سال ان کی کتاب "تاریخ سرکشی بجنور" شائع ہوئی۔ جس میں مئی ۱۸۵۷ء سے اپریل ۱۸۵۸ء تک کے حالات درج ہیں۔
۳۱	اپریل ۱۸۵۹ء	سرسید نے اپنی کتاب "اسباب بغاوت ہند" شائع کرائی۔ اسی سال انہوں نے مراد آباد میں ایک جدید مدرسے کی بنیاد ڈالی اور اسی سال وہ ایک اسپیشل کمیشن کے ممبر مقرر ہوئے جہاں ضبط شدہ جائدادوں کی اپیلیں داخل کی جاتی تھیں۔
۳۲	۱۸۶۰ء	مراد آباد میں سرسید نے اردو سہ ماہی رسالہ "خیر خواہان مسلمان" جاری کیا۔ اور انگریزی سہ ماہی رسالہ "لائل محمڈنز آف انڈیا" بھی جاری کیا۔ اسی سال انہیں قحط زدہ

		لوگوں کی امدادی تنظیم کا مہتمم بنایا گیا۔ اور اسی سال ان کا رسالہ "تحقیق لفظ نصاریٰ" شائع ہوا۔
۳۳	۱۸۶۱ء	سرسید کی کتاب "آثار الصنادید" کے فرانسیسی ترجمے کی اشاعت ہوئی جسے مشہور مصنف گارساں دتاسی نے کیا تھا۔ اسی سال مراد آباد میں ان کی اہلیہ پارسا بیگم کا انتقال ہوا۔
۳۴	۱۸۶۲ء	سرسید نے ضیاء الدین برنی کی "تاریخ فیروز شاہی" کی تصحیح و تدوین کا کام مکمل کیا جسے ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ نے شائع کیا۔
۳۵	۱۲ مئی ۱۸۶۲ء	سرسید کا تبادلہ مراد آباد سے غازی پور ہو گیا۔ اسی سال دورائل ایشیاٹک سوسائٹی کے فیلو مقرر ہوئے۔ اور اسی سال ان کی کتاب "تبیین الکلام" کی پہلی جلد شائع ہوئی۔
۳۶	۱۶ اکتوبر ۱۸۶۳ء	سرسید نے کلکتہ کا پہلا سفر کیا اور وہاں فارسی میں تقریر کی اسی سال انھوں نے رسالہ "التماس بخدمت ساکنان ہند درباب ترقی تعلیم اہل ہند" شائع کیا، اور اسی سال انھوں نے "توزک جہانگیری" کی تصحیح و اشاعت کا کام مکمل کیا۔
۳۷	۹ جنوری ۱۸۶۴ء	سرسید نے سائنٹفک سوسائٹی قائم کی جس نے بہت سی مفید کتابوں کے ترجمے شائع کیے۔ اسی سال انھوں نے غازی پور میں ایک جدید مدرسہ قائم کیا جو وکٹوریہ ہائی اسکول کے نام سے آج بھی وہاں موجود ہے۔

۳۸	یکم اپریل ۱۸۶۴ء	سرسید کا تبادلہ غازی پور سے علیگڑھ ہو گیا۔
۳۹	۴ جولائی ۱۸۶۴ء	سرسید رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن کے اعزازی رکن منتخب ہوئے۔ یہ بہت بڑا اعزاز تھا۔
۴۰	۳۰ نومبر ۱۸۶۴ء	علیگڑھ میں سائنٹیفک سوسائٹی کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔
۴۱	۳۰ دسمبر ۱۸۶۵ء	زراعت کی کتابوں کی اشاعت کے لئے سرسید نے حکومت کو ایک عرضداشت پیش کی۔ اسی سال ان کی کتاب "تبیین کلام" کی دوسری جلد کی اشاعت ہوئی۔
۴۲	۱۴ فروری ۱۸۶۶ء	سائنٹیفک سوسائٹی کی عمارت کا باقاعدہ افتتاح ہوا۔
۴۳	۳۰ مارچ ۱۸۶۶ء	سائنٹیفک سوسائٹی کا اخبار جاری کیا گیا۔ یہی اخبار بعد میں "علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" کہلایا۔
۴۴	۱۰ مئی ۱۸۶۶ء	برٹش انڈیا ایسوسی ایشن قائم ہوئی۔
۴۵	۲ جولائی ۱۸۶۶ء	برٹش انڈیا ایسوسی ایشن کے سکریٹری کی حیثیت سے سرسید نے وائسرائے کی کونسل کو پوسٹل قواعد کی طرف متوجہ کیا۔
۴۶	یکم جنوری ۱۸۶۷ء	ایسٹ انڈیا ایسوسی ایشن لندن کے ممبر مقرر ہوئے۔
۴۷	یکم اگست ۱۸۶۷ء	سرسید نے حکومت کو "ورنا کیولر یونیورسٹی" کی تجویز پیش کی جس میں اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے پر زور دیا گیا تھا۔
۴۸	۱۵ اگست ۱۸۶۷ء	سرسید کا تبادلہ علیگڑھ سے بنارس ہو گیا، اور اسمال کاز کورٹ کے جج کے عہدے پر ترقی بھی ہو گئی۔

۴۹	۲۵ ستمبر ۱۸۶۷ء	سرسید نے بنارس میں ہومیوپیتھک دواخانہ اور ہسپتال قائم کیا اور اس طریقۂ علاج پر لٹریچر بھی لکھا۔
۵۰	۱۸۶۸ء	سرسید نے رسالہ "احکام طعام اہل کتاب" جاری کیا جس میں استدلال کیا گیا تھا کہ مسلمانوں کا انگریزوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا پینا جائز ہے بشرطیکہ حرام چیزیں نہ ہوں۔
۵۱	یکم اپریل ۱۸۶۹ء	سرسید نے اپنے دونوں بیٹوں کے ہمراہ لندن کا سفر شروع کیا اور ۸ مئی ۱۸۶۹ء کو لندن پہنچ گئے۔
۵۲	۶ اگست ۱۸۶۹ء	سرسید کو سی ایس آئی کا خطاب عطا کیا گیا۔ یہ خطاب لندن میں انڈیا آفس لائبریری میں ڈیوک آف ارگائل کے ہاتھوں دیا گیا تھا۔
۵۳	۶ اگست ۱۸۶۹ء	سرسید نے سرولیم میور کی کتاب "لائف آف محمد (۱۸۶۱ء)" کی تردید میں ۱۲ مقالات شائع کرائے جو "خطبات احمدیہ" کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان میں سیرۃ نبوی کا دفاع کیا گیا ہے۔ ہندوستان میں خطبات احمدیہ کی اشاعت ۱۸۸۷ء میں ہوئی۔
۵۴	۴ ستمبر ۱۸۷۰ء	سرسید نے لندن سے ہندوستان واپسی کے سفر کا آغاز کیا۔ انگلستان کے قیام کے دوران انہوں نے کیمبرج یونیورسٹی کا بھی دورہ کیا اور وہاں کے طریقۂ تعلیم کا جائزہ لے کر ایک پمفلٹ شائع کیا جس میں زور دیا گیا تھا کہ ہندوستان میں بھی اسی قسم کی یونیورسٹی کی ضرورت ہے جو ضرور قائم ہونی چاہیے۔

۵۵	۲ اکتوبر ۱۸۷۰ء	سرسید اپنے بیٹے سید حامد کے ہمراہ لندن سے بمبئی پہنچ گئے۔
۵۶	۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ء	سرسید نے ماہانہ اردو رسالہ تہذیب الاخلاق جاری کیا۔ اس وقت ۱۲۸۷ھ کی عید الفطر کا موقع تھا جو بہت مبارک تھا۔
۵۷	۱۸۷۱ء	سرسید نے ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب "ہمارے ہندوستانی مسلمان" کا مدلل جواب شائع کیا جس میں مسلمانوں کا دفاع کیا گیا تھا۔
۵۸	۱۲ مئی ۱۸۷۲ء	سرسید نے علیگڑھ کالج کے لئے چندہ جمع کرنے والی کمیٹی قائم کی جس کا نام "مجلس خزینۃ البضاعت" رکھا گیا۔ اس کا سب سے پہلا سرمایہ امام ضامن کی نیاز کا ایک روپیہ تھا۔
۵۹	فروری ۱۸۷۳ء	علیگڑھ کالج کے قیام کے لئے سرسید نے باقاعدہ اسکیم پیش کی۔
۶۰	۱۵ اپریل ۱۸۷۳ء	کالج کے فنڈ میں ایک لاکھ ترپین ہزار چار سو بانوے روپے آٹھ آنہ جمع ہو چکے تھے۔ یہ بڑی ہمت افزا بات تھی۔
۶۱	۲۶ مئی ۱۸۷۳ء	فراہمی چندہ کے لئے سرسید نے عظیم آباد (پٹنہ) کا دورہ کیا۔ چندے کے لئے سرسید کا یہ پہلا سفر تھا اس کے بعد بہت سے سفر کئے۔

۶۲	۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء	فراہمی چندہ کے لئے سرسید نے لاہور کا دورہ کیا۔ یہ دوسرا سفر تھا۔ پنجاب میں بھی سرسید کی خوب پذیرائی ہوئی۔
۶۳	۲۴ مئی ۱۸۷۵ء	مدرسۃ العلوم (ایم اے او اسکول) کا علیگڑھ میں باقاعدہ افتتاح ہوا۔ اس تقریب میں شرکت کرنے کیلئے سرسید بنارس سے آئے تھے۔ یہ ملکہ وکٹوریہ کی سالگرہ کا دن تھا۔
۶۴	۳۱ جولائی ۱۸۷۶ء	سرسید نے قبل از وقت ریٹائر ہونے کے لئے حکومت کو درخواست دی جو منظور ہو گئی اور چار سو روپیہ ماہوار پنشن مقرر ہوئی۔
۶۵	اگست ۱۸۷۶ء	سرسید مستقل قیام کے لئے علیگڑھ آ گئے۔ انہوں نے علیگڑھ کالج کی خدمت کے ساتھ ساتھ "تفسیر القرآن" بھی لکھنی شروع کر دی۔ جس کی پہلی جلد ۱۸۸۰ء میں شائع ہوئی، دوسری جلد ۱۸۸۲ء میں، تیسری جلد ۱۸۸۵ء میں، چوتھی جلد ۱۸۸۸ء میں، پانچویں جلد ۱۸۹۲ء میں، چھٹی جلد ۱۸۹۵ء میں، اور ساتویں جلد سرسید کی وفات کے بعد ۱۹۰۴ء میں شائع ہوئی۔ یہ تفسیر القرآن سات جلدوں کے باوجود نامکمل رہ گئی۔ صرف ۳/۵ حصہ کی تفسیر لکھی جا سکی۔
۶۶	۸ جنوری ۱۸۷۷ء	علیگڑھ کالج کا باقاعدہ طور پر سنگ بنیاد رکھا گیا اور اس تقریب میں سرسید نے لارڈ لٹن کو سپاس نامہ پیش کیا۔

۶۷	۲ جون ۱۸۷۷ء	سریندر ناتھ بنرجی کی آمد پر علیگڑھ میں جلسہ ہوا۔ سرسید نے صدارت کی۔
۶۸	۲۰ اکتوبر ۱۸۷۸ء	کالج فنڈ کیلئے حکومت کی اجازت سے تیس ہزار روپے کی انعامی لاٹری کا اعلان کیا۔
۶۹	۱۸۷۸ء	سرسید امپیریل کونسل کے رکن مقرر ہوئے۔ اور وائسرائے کی لجسلیٹو کونسل کے ممبر نامزد ہوئے۔
۷۰	۱۱ دسمبر ۱۸۸۰ء	اسٹریچی ہال کا نام سر جان اسٹریچی کے نام پر رکھا گیا۔ اسی سال سرسید کا رسالہ "ھوالموجود" بھی شائع ہوا۔
۷۱	۱۸۸۲ء	سرسید کو ایجوکیشن کمیشن کا ممبر مقرر کیا گیا۔
۷۲	۱۸۸۳ء	سرسید نے محمڈن ایسوسی ایشن قائم کی۔
۷۳	۷ مئی ۱۸۸۳ء	سریندر ناتھ بنرجی کی گرفتاری کے خلاف اور انکی سزا کے خلاف علیگڑھ میں جلسہ ہوا۔ سرسید نے صدارت کی۔
۷۴	۱۱ اگست ۱۸۸۳ء	سرسید نے محمڈن سول سروس فنڈ ایسوسی ایشن قائم کی۔
۷۵	۲۷ نومبر ۱۸۸۵ء	سرسید نے کرنل گریہم کو شکریہ کا خط لکھا جنہوں نے لندن سے سرسید کی سوانح عمری کی پہلی جلد بذریعہ ڈاک بھیجی تھی۔
۷۶	۲۷ دسمبر ۱۸۸۶ء	سرسید نے محمڈن ایجوکیشنل کانگریس قائم کی جس کا نام بعد میں ۱۸۹۰ء میں سید رضا حسن کی تحریک پر مسلم ایجوکیشنل کانفرنس رکھا گیا۔

۷۷	یکم جنوری ۱۸۸۷ء	حکومت برطانیہ نے سر سید کو سر کا خطاب عطا کیا۔ اسی سال لارڈ ڈفرن نے سر سید کو سول سروس کمیشن کا ممبر مقرر کیا۔
۷۸	۱۳ مارچ ۱۸۸۸ء	سر سید کے چھوٹے بیٹے سید محمود کی شادی مشرف جہاں بیگم سے ہوئی۔ ان کے بیٹے سید راس مسعود کی ولادت ۱۵ فروری ۱۸۸۹ء کو ہوئی۔
۷۹	مئی ۱۸۸۸ء	علیگڑھ میں ایک جلسے میں باقاعدہ طور پر سر سید کو کے سی ایس آئی (نائٹ کمانڈر اسٹار آف انڈیا) کا خطاب دیا گیا۔
۸۰	اگست ۱۸۸۸ء	سر سید نے پیٹریاٹک ایسوسی ایشن کی بناء ڈالی۔
۸۱	۲۱ فروری ۱۸۸۹ء	سر سید نے تین قلمی کتابیں اپنے پوتے راس مسعود کو ہبہ کیں۔ قرآن کریم، احادیث نبوی، اور دیوان حافظ۔
۸۲	جولائی ۱۸۸۹ء	ایڈنبرا یونیورسٹی نے سر سید کو ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگری عطا کی۔
۸۳	۲۸ دسمبر ۱۸۸۹ء	کمیٹی "تخزینۃ البضاعت" کے آخری جلسے میں قانون ٹرسٹیان پاس ہوا جس کی رو سے سر سید کو لائف آنریری سیکریٹری اور سید محمود کو لائف آنریری جوائنٹ سیکریٹری بنادیا گیا۔
۸۴	۱۲ اگست ۱۸۹۰ء	بورڈ آف ٹرسٹیز کا پہلا جلسہ ہوا۔
۸۵	ستمبر ۱۸۹۱ء	سر سید ڈیپوٹیشن لے کر بھوپال اور حیدر آباد گئے۔ بھوپال سے ۱۲ ہزار اور حیدر آباد سے ۲۴ ہزار روپے سالانہ طے۔

۸۶	۲۵ جون ۱۸۹۲ء	انجمن الاخوۃ کا قیام عمل میں آیا جس میں اپنی آمدنی کا ایک فیصد ادا کرنا پڑتا تھا۔ اس سے لوگوں کی امداد ہوتی تھی اسی سال انہوں نے اپنی کتاب "تحریر فی اصول التفسیر" لکھی۔
۸۷	۱۸۹۳ء	سرسید نے اپنی کتاب "ابطال غلامی" شائع کرائی۔
۸۸	جنوری ۱۸۹۳ء	بڑے بیٹے سید حامد کا انتقال ہوا۔
۸۹	۳۰ دسمبر ۱۸۹۳ء	محمڈن اینگلو اورینٹل ڈیفنس ایسوسی ایشن آف اپر انڈیا قائم ہوئی۔
۹۰	جولائی ۱۸۹۵ء	علیگڑھ کالج کے ہیڈ کلرک شیام بہاری لال ماتھر نے کالج فنڈ کا ایک لاکھ پانچ ہزار روپیہ غبن کر لیا۔ یہ ہیڈ کلرک سرسید کا قابل اعتماد آدمی تھا لیکن پھر بھی اس نے دھوکا دیا۔ یہ صدمہ سرسید کے لئے ناقابل برداشت تھا جو جانکاہ ثابت ہوا۔ تین سال بھی نہ گزرے تھے کہ سرسید کا انتقال ہو گیا۔
۹۱	۱۸۹۶ء	سرسید نے اپنے نانا خواجہ فرید الدین کے حالات زندگی پر ایک کتاب تصنیف کی جس کا نام "سیرت فریدیہ" رکھا۔
۹۲	۲۲ نومبر ۱۸۹۶ء	سرسید نے ہز ہائی نس محمد شاہ آغا خان سوم کے اعزاز میں ایک سپاس نامہ پیش کیا اور ان کا شکریہ ادا کیا۔
۹۳	مارچ ۱۸۹۸ء	سرسید نے ایک عیسائی پادری کی کتاب "امہات المومنین" کے جواب میں رسالہ لکھنا شروع کیا۔

۹۴	۲۴ مارچ ۱۸۹۸ء	سرسید کو علیگڑھ میں احتباس بول کا عارضہ شروع ہوا جو ہر قسم کے علاج کے باوجود بڑھتا ہی چلا گیا۔
۹۵	۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء	سرسید کا انتقال علیگڑھ میں رات کے دس بجے کے قریب ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ وہ اتوار کا دن تھا اور ۳ ذی قعدہ ۱۳۱۵ھ کی اسلامی تاریخ تھی۔
۹۶	۲۸ مارچ ۱۸۹۸ء	سوگوار مسلم قوم کے افراد کی آہ و بکا کے ساتھ علیگڑھ کالج کی مسجد کے شمالی گوشے میں کھلے ہوئے صحن کے اندر قبل نماز مغرب سرسید کے جسد خاکی کو دفن کر دیا گیا لیکن ان کی روح آج بھی اس علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کی نگرانی کر رہی ہے، جو ان کی وفات کے بعد ۱۷ دسمبر ۱۹۲۰ء کو قائم ہوئی۔

☆

Head of Department Electronics,
Aligarh Institute of Technology.

maablib.org

maablib.org

[illegible]